ISSN 0974-7346

جولائی ۲۰۲۴ء

جلد ۲۱۱ ـــــ عدد ۷

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY,

AZAMGARH

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۳۵۰؍روپے۔ فی شمارہ ۳۰؍روپے رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴؍روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰؍روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰؍روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰؍روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰؍روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۳۵۰؍روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔
اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

(Ma'arif Section) 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۱ ماہ ذی الحجہ ۱۴۴۵ھ مطابق ماہ جولائی ۲۰۲۴ء عدد ۷

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
Email: info@shibliacademy.org

شذرات

خدا خدا کر کے الیکشن کی بے قراریوں کو قرار آیا، ملک جس قیامت کے تصور سے لرزاں تھا وہ بپا ہوئی اور اس طرح کہ وہ خافضہ رافعہ کے معانی کی ایک جھلک بھی پیش کر گئی، پست کرنا، ذلیل کرنا اور بلندی و رفعت تک پہنچانا۔ قدرت کے اس عمل کا ظہور یقیناً اس دن کے لیے ہے جب سارا حساب پورا کیا جائے گا، لیکن اس دنیائے دنی کے تکوینی نظام میں بھی قدرت کبھی کبھی انسانوں کو ایسی کیفیات سے آشنا کرا جاتی ہے جہاں چشم زدن میں سر پُر غرور، خاک آلود نظر آنے لگتے ہیں۔ انتخابات کے نتائج کیا آئے کہ شور و غل اور وعیدوں اور تہدیدوں کی پیمائش کے نشانات زبر زیر ہونے لگے۔ جہاں ہر اسٹیج پر پانسو سالہ غلامی کی ہر نشانی کو مٹانے کی بات عام تھی اور جس کے متعلق اندیشہ تھا کہ مفروضہ اعداد کے حصول کے بعد عملاً ان کا عملی ظہور بھی ہو کر رہے گا، وہ خافضہ رافعہ کے ازلی وابدی قانون الٰہی کی زد میں اس طرح آیا کہ زبانوں سے ایک بار پھر **بیدک الخیر** کی حقیقت جاری ہوگئی۔

***

ہوا یہ کہ حکومت کی تصویر تو وہی رہی جو پہلے تھی لیکن اس تصویر کے رنگ بہر حال پھیکے پڑ گئے، بے مہار قوت اظہار، مصلحت و منافقت کے زیر اثر جس طرح کمزور ہوئی اس کی ایک مثال نالندہ یونیورسٹی کے نئے کیمپس کے افتتاح کے موقع پر سامنے آگئی، نالندہ بہار میں قدیم زمانہ کے بے زبان کھنڈروں پر مشتمل ایک خطہ کا نام ہے، ان کھنڈروں کے متعلق ایک قدیم سیاح ہیون سانگ کے حوالہ سے انگریزوں کے زمانہ میں یہ بات مشہور کی گئی کہ یہ وہ دارالعلوم یا یونیورسٹی تھی جس کو مگدھ کے راجہ شنکرادتیہ نے قائم کیا تھا، اس کی شہرت پھیلی تو ایک وقت میں دس ہزار طلبہ اور ڈیڑھ ہزار اساتذہ یہاں تعلیم و تدریس میں نظر آنے لگے، چاروں طرف بدھ علما اور مبلغین کے مکانات تھے، ان کی شان دیکھ کر لوگ مبہوت رہ جاتے تھے۔ کئی کتب خانے تھے جن میں ہزاروں لاکھوں کتابیں تھیں، اپنے عہد کے سارے ترقی یافتہ علوم وفنون کی تعلیم مفت تھی، البتہ داخلہ کا امتحان بڑا سخت ہوتا تھا، یہاں تک تو ہیون سانگ کے نام سے معلومات کا فروغ تھا لیکن انگریزی دور کے پروردہ مورخین کی بڑی دیدہ دلیری سے ہیون سانگ کی کہانی کے آخر میں یہ جملہ جوڑنے لگے کہ ”مسلمانوں کے زمانہ میں اس یادگار اور فیض بار جامعہ کی ہستی خاک میں مل گئی“، ٹیکسلا کی درس گاہ کے ذکر میں بھی گوری شنکر اوجھا جیسے مورخ آخر میں یہ کہنا نہیں بھولے کہ ”یہ

جامعہ بھی مسلمانوں کے زمانہ میں غارت ہوئی''، یعنی مندروں، قلعوں، محلوں کے بہانے تاریخ کی دیواروں پر ان گھڑے ہوئے جملوں سے جس طرح ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے اور پھر ان دونوں پر بغیر کسی مزاحمت کے خوف کے حکومت کرنے کا جو نسخہ تیار ہوا ہمارے مرعوب مورخوں کے ذریعہ اس کو منصوبہ بند طریقہ سے رائج کر دیا گیا۔

***

گذشتہ صدی میں آہستہ آہستہ اور گزرے دس بیس برسوں میں بڑی تیزی سے اس موہوم اور مفروضہ تاریخ کے سہارے زخموں کی جو کاشت کی گئی اس کا نتیجہ مندروں، مسجدوں اور بے شمار تاریخی اہمیت کی حامل عمارتوں کی شکست وریخت میں سامنے آیا، عمارتوں کی شکست وریخت تو کسی درجہ برداشت کے لائق تھی لیکن دلوں کا ٹوٹنا معمولی سانحہ نہیں۔ اب یہی زخم نالندہ یونیورسٹی کی تقریب سے رستا نظر آیا، سوشل میڈیا پر مسلمانوں کے ظلم، غارت گری اور ان کی علم دشمنی کا پرفریب ذکر عام کیا جانے لگا، بہار صوبہ کی سیاست اس قسم کے ناسوروں کو بڑھاوا دینے کے لیے نفرتی طبقہ کو زیادہ سازگار نظر آتی ہے، اس لیے بختیار خلجی کو نئے بابر اور اورنگ زیب کی شکل میں پیش کر کے کہا جانے لگا کہ یہ وہی غیر ملکی حملہ آور ہے جس نے نالندہ کو تباہ کر دیا، کتب خانہ کو جلا کر لاکھوں کی تعداد میں علم وحکمت کے شہ پاروں کو نیست ونابود کر دیا اور جس طرح کتب خانہ اسکندریہ کو جلانے کا فسانہ اسلام دشمن ذہنوں نے پھیلا دیا تھا، سوچا گیا کہ اسی طرح نالندہ کے کتب خانہ کے جلائے جانے کی جھوٹی تاریخ کو اس طرح بیان کیا جائے کہ دلوں میں نفرت کے سوا کچھ باقی نہ بچے، مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، نئے حالات میں پرانے وزیر اعظم کی زبان یہ تو کہتی رہی کہ نالندہ سچائی کا اعلان ہے، کتابیں جل سکتی ہیں لیکن شعلے علم کو نہیں مٹا سکتے، مگر خود وزیر اعظم کے دل کے شعلے زبان پر اپنی لپٹیں روک نہ سکے کہ لائبریری کو غیر ملکی حملہ آوروں نے جلا دیا لیکن علم کو نہ جلایا جا سکا یا یہ کہ نالندہ کی تباہی نے ہندوستان کو اندھیروں میں ڈھکیل دیا تھا اور اب اس کی بحالی ہندوستان کے سنہرے دور کا آغاز ہے، مفاہیم کی اہمیت کو درکنار کرتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ ''جو قومیں مضبوط انسانی اقدار پر کھڑی ہیں وہ جانتی ہیں کہ تاریخ کو زندہ کر کے بہتر مستقبل کی بنیاد کیسے رکھی جاتی ہے'' تو یہ محض لفاظی ہے، اس لفاظی نے چند برسوں میں ملک کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، کوئی ان سے پوچھے جو واقعتاً مضبوط انسانی قدروں پر ایمان رکھتے ہیں۔

***

قریب سو سال پہلے یعنی ۱۹۳۵ء میں مدیر معارف مولانا سید سلیمان ندویؒ نے نالندہ کی سیر کی تھی اور اس سیر کو زیارت کا نام دیا تھا کہ باوجود قربت کے اس کی زیارت کیوں نہ ہوئی، اس وقت انہوں نے سعدی کے اس

قول کو خود پر منطبق بھی کیا کہ "سبحان اللہ دوراں باخبر و نزدیکاں بے بصر" ہم نے یہ الفاظ یوں ہی نقل نہیں کیے، ان سے ایک مسلمان مورخ کی اس ایماندارانہ سوچ اور عقیدت کو دیکھنا ہے جس سے اپنے ملک کے شاندار ماضی سے محبت کا احساس ہوتا ہے، سید صاحب نے لکھا کہ نالندہ نام تو آثار قدیمہ کی دریافت کے بعد کا نام ہے، پہلے اس گاؤں کو بڑا گاؤں کہا جاتا تھا، بعد میں نالندہ کی تلاش شروع ہوئی، کھدائی کا کام جاری ہوا، عمارتوں کی بنیادیں اور دیواریں ملنے لگیں، بتایا گیا کہ بودھوں کی خانقاہ تھی، رفتہ رفتہ یہ درسگاہ بن گئی، سید صاحب نے اوجھا کی تحریر نقل کرنے کے بعد اس کے آخری جملہ کے متعلق لکھا کہ یہ اتنی ترمیم کے ساتھ صحیح ہے کہ نالندہ کی خانقاہ یا درس گاہ مسلمانوں کے زمانہ میں نہیں بلکہ محمد بختیار خلجی کے حملۂ بہار کے وقت اثنائے جنگ میں ایسی منتشر و پراگندہ ہوئی کہ پھر اس کا شیرازہ نہ بندھ سکا، عمارتوں کو نقصان پہنچانے یا ان کو جلائے جانے کے متعلق اصل حالات کو طبقات ناصری کے مولف نے اس شخص سے سن کر لکھے جو بختیار خلجی کے ساتھ اس حملہ میں شریک تھا، اس معاصر شہادت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے نہ عمارتوں کو برباد کیا اور نہ کتابوں کو نقصان پہنچایا، خود ان عمارتوں کا وجود اس سچائی کا گواہ ہے بلکہ وہ تو یہ بھی بتاتی ہیں کہ یہ مقام مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی متعدد بار ویران ہوا اور آباد بھی ہوا، اور یہ سب بودھوں کے دشمن ہندو برہمنوں کے ذریعہ ہوا، درس گاہ بند ہونے کی ایک وجہ تو یہ رہی کہ جو زمینیں وقف کے طور پر تھیں وہ نئے فاتحوں کے حصہ میں آ گئیں اور چونکہ بودھ دھرم کے ماننے والے اس ملک میں باقی نہیں بچے تھے اس لیے ان اوقاف کے دوبارہ اجرا کے لیے ہندو رعایا کی طرف سے کوئی تحریک نہیں ہوئی، یہ باتیں اس لیے بھی قرین قیاس ہیں کہ بودھوں کی خانقاہیں اور درس گاہیں بھی اسی ظلم کا شکار ہوئیں، مدھیہ پردیش میں سانچی کے استوپا، اشوک جیسے بودھ بادشاہ کی تباہی کے بعد صدیوں ویران رہے، ان کو ویران کرنے کے لیے کون سا بختیار خلجی تھا؟ سید صاحب کا یہ سفرنامۂ نالندہ اپنی دلچسپی اور اس سے زیادہ مستند تاریخی معلومات کے لیے بار بار پڑھے جانے کے لائق ہے، کمال یہ ہے کہ تاریخ کی کسی مستند کتاب میں خواہ وہ کے ایس لال کی خلجی خاندان ہو یا پھر انگریزوں ہی کے دور میں لکھی گئی ذکاء اللہ کی تاریخ ہندوستان ہو یا پھر فرشتہ کی تاریخ ہو، بختیار کے حملوں کا ذکر تو ملتا ہے لیکن کتب خانہ کے جلائے جانے کا کہیں ذکر نہیں۔

***

ابھی ابھی یہ نہایت اندوہ ناک خبر ملی کہ جناب سجاد الٰہی نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ دیا، انا للہ .....کیا شخصیت تھی، پاکستان میں چلتے پھرتے دار المصنّفین تھے۔ جگہ یہیں ختم ہو گئی لیکن یادوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔

***

مقالات

شاہ عبدالعزیز اور بستان المحدثین

ڈاکٹر محمد خالد خاں عمری

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

mkhan45@jmi.ac.in

ہندستان میں علم حدیث کی خدمت کا سلسلہ اسی وقت سے قائم و جاری رہا ہے جب سے مسلمانوں نے یہاں قدم رکھے۔ سندھ، دیبل، ٹھٹھ کے قدیم مدارس اور اب ان کے کھنڈرات اس کی واضح مثال ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی نے اپنی کتاب " جهود مخلصة فی خدمة السنة المطهرة "میں محمد بن قاسم کے ہمراہ ہندستان آنے والے ان علماء کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے علم حدیث کی خدمت انجام دی۔ وہ لکھتے ہیں:

ونذكر هنا أسماء بعض علماء الحديث الذين وفدوا الى بلاد الهند في هذه القرون على سبيل المثال لا على سبيل الحصر، ١ـ موسىٰ بن يعقوب الثقفي ٢ـ يزيد بن أبي كبشة الدمشقي ٣ـ أبو موسى إسرائيل بن موسى البصري نزيل الهند ٤ـ أبوحفص الربيع بن صبيح السعدي[1]ـ

(ہم اس زمانے میں ہندستان آنے والے بعض علمائے حدیث کے نام بطور مثال پیش کرتے ہیں نہ کہ بطور حصر: ۱- موسیٰ بن یعقوب ثقفی، ۲- یزید بن ابی کبشہ دمشقی ۳- ابوموسی اسرائیل بن موسی مقیم ہند، ۴- ابوحفص ربیع بن صبیح سعدی)۔

روایتوں میں آتا ہے کہ عباسی خلیفہ مہدی باللہ نے عبدالملک بن شہاب المسمعی کی سربراہی میں ایک فوج کو ہندستان روانہ کیا تھا۔ اس کا مقصد جہاد تھا۔ اس قافلے میں ابوبکر ربیع بن صبیح المسوری البصری بھی تھے جن کو تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ربیع پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم حدیث شریف میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی۔ حاجی خلیفہ کاتب چلپی (م: ۱۰۶۷ء) نے کشف الظنون

۱۔ فریوائی، عبدالرحمٰن، جهود مخلصة فی خدمة السنة المطهرة، ادارۃ البحوث الاسلامیۃ، سلفیہ بنارس، ۱۹۸۹ء، ص ۲۳

میں لکھا ہے: ''ھو أول من صنّف في الاسلام ''یعنی ربیع وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مسلمانوں میں کوئی کتاب تصنیف کی۔ ربیع جس فوج کے ہمراہ ہندستان آئے تھے، وہ گجرات کے علاقے بھروچ پہنچی، جہاں بدقسمتی سے ایک مہلک وبا نے ان کو گھیر لیا، اور ہزاروں لوگ اس کا شکار ہوگئے۔ ربیع بن صبیح کا بھی اسی بیماری میں انتقال ہوگیا۔ ان کا مزار آج بھی بھروچ میں موجود ہے۔[۲]

اس وقت تک ہندستان میں اسلام اپنی ابتدائی اور خالص شکل میں لوگوں کے سامنے آیا تھا، جس کی اساس کتاب وسنت پر تھی۔ اس کے بعد جب سندھ میں عربوں کی حکومت ختم ہوگئی اور ان کے بجائے غزنوی اور غوری سلاطین سندھ پر قابض ہوئے تو خراسان اور ماوراءالنہر علاقوں سے علماء سندھ میں آنے لگے، تب سے علم حدیث اس علاقے میں بہت کم ہوگیا اور علوم دینیہ میں فقہ واصول فقہ کا رواج زیادہ ہوگیا۔[۳]

تاہم سندھ و گجرات میں علم حدیث کی خدمت کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں جاری رہا۔ اس کا اعتراف مسعودی، بشار اور ابن حوقل جیسے بڑے مورخین نے کیا ہے۔ قاضی اسلم سیف نے علامہ بلاذری کی فتوح البلدان کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> امام علی بن موسیٰ کی درس گاہ دیبل کی سب سے بڑی درس گاہ تھی، جس میں حدیث کو باقاعدہ پڑھایا جاتا تھا اور اس کی نشر واشاعت کا انتظام بھی تھا۔[۴]

سندھ میں علم حدیث کے فروغ کی روایت میں ابوالفضائل حسن صغانی لاہوری بدایونی کا نام نہایت اہم ہے۔ انھوں نے مشارق الانوار، مصباح الدجی شرح صحیح بخاری وغیرہ جیسی متعدد کتابیں، علم حدیث میں تصنیف کیں۔ ان کے علاوہ شیخ ابوالحسن سندھی، شیخ ابوالحسن سندھی صغیر اور علامہ محمد حیات سندھی کے نام سندھ کے علمائے حدیث کے طور پر بہت اہم ہیں۔

گجرات کے علاقے میں شیخ علی متقی برہان پوری صاحب کنزالعمال، محمد طاہر پٹنی صاحب مجمع بحارالانوار

۲۔ حسنی، عبدالحکیم سید عبدالحی، یادایام، علی گڑھ، ۱۹۱۹ء، ص ۸۔۹

۳۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حکیم سید عبدالحی لکھنوی کی کتاب الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، مجمع اللغۃ العربیۃ، دمشق، ۱۹۸۳ء، ص ۱۳۵

۴۔ فیروز پوری، قاضی محمد اسلم سیف، تحریک اہل حدیث تاریخ کے آئینے میں، مکتبہ قدسیہ، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۳۷

خدمت حدیث کے حوالے سے بڑے نام ہیں۔ دہلی میں بھی، جو زیادہ تر شمال ہند میں سلاطین کا دارالحکومت رہا، علم حدیث کی خدمت کی روایت پھلتی پھولتی رہی، اگرچہ یہ روایت اس قدر مضبوط اور طاقتور نہیں تھی جتنی سندھ اور گجرات اور جنوبی ہند کے علاقوں میں رہی۔ شاید اس کی وجہ اس وقت کے سلاطین دہلی کا معقولات اور فقہ وتقلید کی طرف رجحان کا زیادہ ہونا اور علم حدیث سے کسی حد تک بے اعتنائی کا رویہ رہا ہو۔ تاہم شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کے خانوادے کی خدمات حدیث کو علمائے دہلی کے حوالے سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ آگے چل کر دہلی میں خدمت حدیث کی اس روایت کو ایک مہم میں بدلنے اور تقلید کے عمومی رجحان کو بدلنے اور کم کرنے کا کام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے بعد ان کے خانوادے نے جس طرح انجام دیا، وہ نہایت گراں قدر اور قابل ستایش ہے۔ اس خانوادے نے ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکر مار کر تحریک پیدا کرنے کا کام انجام دیا۔ انھوں نے تقلید کے بندھن کو توڑا، فقہ وحدیث میں تطبیق کی راہ ہموار کی اور ہر اس قول کو جو مطابق حدیث ہو قبول کرنے اور جو حدیث سے متصادم ہو اسے ترک کرنے کی روایت کو فروغ دیا۔ خانوادۂ شاہ ولی اللہ میں خدمت حدیث کے حوالے سے ایک بڑا نام شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا ہے۔ شاہ عبدالعزیز شاہ ولی اللہ کے لائق وفائق بیٹے تھے۔ انھوں نے علم حدیث کے فروغ کے لیے علمی سطح پر بہت سی خدمات انجام دیں، متعدد کتب تصنیف کیں۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی سنہ ۱۷۴۶ء مطابق ۱۱۵۹ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز نے تیرہ برس کی عمر میں اس وقت کے مروجہ علوم کی تحصیل سے فراغت حاصل کر لی۔ تحصیل فراغت کے بعد سماعت حدیث کے لیے انھوں نے مدرسہ رحیمیہ میں شمولیت اختیار کی۔ مدرسہ رحیمیہ انھی کے والد بزرگوار شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا دہلی میں قائم کردہ ادارہ تھا جس کے تحت شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کا کارخیر انجام دینے کا عزم کیا تھا۔ انھوں نے وہاں رہ کر تقلیدی بندشوں سے آزاد ہو کر مجتہدانہ انداز سے نہ صرف بہت سی کتب تصنیف فرمائیں، بلکہ درس وتدریس کے ذریعے خدمت حدیث کا اہم کام انجام دیا۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے لائق فرزند کی ذہانت اور فہم وفراست کو دیکھ کر فرط مسرت سے شاہ عبدالعزیز کو علوم حدیث کا درس دینے کی اجازت عطا کی۔ شاہ عبدالعزیز نے اس طرح خدمت حدیث کی اپنے والد کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد شاہ

عبدالعزیز تقریباً ۱۲ سال تک علوم حدیث و تفسیر کی درس و تدریس میں مصروف رہے اور پرفتن دور میں تفسیر قرآن و علم حدیث کی تشہیر کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔

ہندستان میں اس وقت تمام محدثین کا سلسلہ شاہ عبدالعزیز کے واسطے سے ہی امام شاہ ولی اللہ پر منتہی ہوتا ہے۔ اگرچہ آپ نے تفسیر و فقہ پر بھی پوری توجہ دی، لیکن نسبتاً حدیث نبویؐ کی آبیاری غیر معمولی انہماک اور توجہ سے کی۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت تک کے علوم متداولہ میں آپ نے ہر علم کی طرف توجہ دی۔ شاید اسی لیے آپ کی درس گاہ سے بہت سے ایسے علماء نے کسب فیض کیا، جو بعد میں چل کر علوم و فنون کی دنیا میں شہرت کے مقام کو پہنچے۔

شاہ عبدالعزیز کے درس و تدریس کا دائرہ سمرقند، بخارا، مصر اور شام تک پھیلا ہوا تھا۔ ہندستان میں شاید ہی کوئی علاقہ یا شہر ہو جہاں کے کسی نہ کسی نے آپ کے خاندان سے باطنی استفادہ نہ کیا ہو یا جسے شاگردی کا فخر حاصل نہ رہا ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بڑے بڑے علماء آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا باعث افتخار سمجھتے تھے۔ آپ کی تصانیف اور کتب اہل علم و فضل کے درمیان قابل استفادہ و اعتبار متصور کی جاتی تھیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے شاہ محمد دہلوی کے شاگرد شیخ محمد تھانوی سے نقل کیا ہے کہ ''انھوں نے شاہ عبدالعزیز کی نسبت فرمایا کہ شاہ صاحب کو چھ ہزار احادیث کے متن یاد تھے''۔ [۵]

وہ بیک وقت مفسر بھی تھے اور محدث بھی۔ صاحب شریعت اور صاحب طریقت بھی تھے اور خطیب و متکلم بھی۔ ان کا عہد سیاسی، سماجی اور مذہبی اعتبار سے نہایت کشمکش اور بے چینی کا دور تھا۔ ایسے نامساعد حالات میں شاہ عبدالعزیز نے دین کی جو خدمت انجام دی اور بالخصوص علوم حدیث کے فروغ کی جو کوشش کی وہ نہایت اہم ہے۔

شاہ عبدالعزیز نے علم حدیث میں دو مشہور کتابیں بستان الہند اور عجالۂ نافعہ تصنیف کیں۔ آپ کی یہ دونوں کتب علوم حدیث کا ذخیرہ ہونے کے باعث مقبولیت اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ عجالۂ نافعہ اصول حدیث سے متعلق کتاب ہے جب کہ بستان المحدثین حدیث اور ان کے مؤلفین کے حالات و تعارف پر مشتمل ہے۔

۵۔ تھانوی، اشرف علی، الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ، اشرف المطابع، تھانہ بھون، ۱۹۳۹ء، ج ا ص ۲۶۳

شاہ صاحب نے بستان المحدثین فارسی زبان میں تصنیف کی لیکن افادیت کے پیش نظر کئی ناشروں نے اس کا ترجمہ اردو زبان میں بھی شائع کیا ہے، جن میں مطبع محمدی لاہور، مطبع مجمع مطابع کراچی اور مکتبہ مدینہ دیوبند شامل ہیں۔ اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرے سامنے اس کا جو ترجمہ موجود ہے وہ مولانا عبدالسمیع کا کیا ہوا ہے اور اس پر نظر ثانی شبیر احمد محمدی نے کی ہے۔ یہ ترجمہ مکتبہ مدینہ دیوبند نے ۲۰۰۱ء میں شائع کیا ہے۔

بستان المحدثین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی ایک لاجواب تصنیف ہے، جو محدثین کے حالات کا جامع مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں شاہ صاحب نے تقریباً ایک سو کتب حدیث کا تعارف کراتے ہوئے ان کے مصنّفین کی سوانح عمریاں نہایت تفصیل سے بیان کی ہیں۔

"حیات ولی" کے مصنف مولوی محمد رحیم بخش کہتے ہیں:

بارہویں صدی کے بعد جو کتابیں سلف کی یادگار میں لکھی گئی ہیں، وہ سب اسی سے اخذ کی گئی ہیں۔ یہ کتاب مصنف کی دینی وعلمی تحقیقات اور تاریخ پر ان کے عبور ومہارت پر دلالت کرتی ہے۔ نیز دل کش اور خوب صورت انداز بیان کی وجہ سے یہ بے نظیر اور لاجواب تصنیف ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے کتاب کے آغاز میں اس کا مقصد تالیف یوں بیان فرمایا ہے کہ اکثر رسائل وتصانیف میں ایسی احادیث نقل کی جاتی ہیں کہ ان احادیث کا مطالعہ کرنے والے متعلقہ کتب کے پردۂ تاریکی میں ہونے کے باعث حیرت و استعجاب کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کتابوں کے تذکرے کے ساتھ ہی ان مصنّفین کی شہرت کی وجہ سے ان کے حالات زندگی کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ علم حدیث کے مطالعے سے قبل اس کتاب کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنا چاہیے، تاکہ محدثین اور ان کی تصانیف کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکیں۔[۶]

شاہ عبدالعزیز نے اس کتاب میں دوسری، تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں حدیث سے متعلق تصنیف کردہ بیشتر معروف ومشہور کتب اور ساتھ ہی مصنّفین کا تعارف جامع انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ غرضِ تصنیف بیان کرتے ہوئے خود شاہ صاحب نے فرمایا ہے:

اکثر رسالوں اور تصانیف میں ایسی کتابوں سے حدیثیں نقل کی جاتی ہیں جن پر اطلاع نہ ہونے کی

۶۔ ڈار، ثریا، شاہ عبدالعزیز اور ان کی علمی خدمات، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۶۴

وجہ سے سننے والوں کو حیرانی پیش آتی ہے۔ اس وجہ سے اصل مقصود تو ان کتابوں کا ذکر ہے مگر ساتھ ہی ان کے مصنّفین کا بھی ذکر کیا جائے گا۔ اس لیے کہ مصنف سے اس تصنیف کی قدر معلوم ہوتی ہے۔[۷]

اس کتاب کے انداز اور اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے شاہ صاحب مزید لکھتے ہیں:

ہمارا مقصود فقط متون کا ذکر ہے۔ مگر بعض شرحوں کا بھی اس وجہ سے ذکر کیا جائے گا کہ کثرت شہرت، کثرت نقل اور غایت درجہ اعتماد کی وجہ سے اگر ان کو متون کا حکم دیا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔[۸]

شاہ صاحب نے واضح کر دیا ہے کہ کتب حدیث کے متون کے علاوہ شرحوں کا متن بھی ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی مصنّفین کے احوال بھی بیان کیے گئے ہیں تا کہ ان کتابوں اور شرحوں کی اہمیت اور ان کی قدر و منزلت کا اندازہ ہو سکے۔

اس مقالے میں ان تمام کتب اور ان کے مصنّفین کا تفصیلی ذکر ممکن نہیں لیکن بہ طور نمونہ دو ایک کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے شاہ صاحب کی علم حدیث، فنون حدیث اور مصنّفین کتب حدیث کے بارے میں گہری معلومات اور دقیق مسائل میں نکتہ سنج طبیعت اور تحقیقی ادراک کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شاہ صاحب نے سب سے پہلے مؤطا امام مالک کا تذکرہ کیا ہے۔ امام مالک کی سوانح حیات کے ساتھ مؤطا کے ان سولہ مختلف نسخوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے جو امام مالک کے مختلف شاگردوں نے پیش کیے۔ اسی طرح اس عہد کی تصنیف شدہ مسانید میں مسند امام اعظم، مسند امام شافعی، مسند امام احمد بن حنبل اور مسند ابوداؤد طیالسی کا تذکرہ بھی کافی تفصیل سے کیا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری اور تیسری صدی میں تیار ہونے والی مصنّفات، مسندات کتب ستہ، مستدرکات و مستخرجات اور ان کے مصنّفین کے احوال و کوائف کا احاطہ بھرپور انداز میں کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ شاہ صاحب نے جب کسی محدث کی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالی ہے تو اس کے اپنے خصائل و عادات، حلیہ، دینی و علمی خدمات اور تصانیف کی اہمیت کی وضاحت کی ہے اور ساتھ ہی مختصراً اس محدث کے تلامذہ اور شاگردوں کی سوانح کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس محدث کے اپنے اشعار اور پھر اس محدث کی شان میں دوسروں کے اشعار کا بھی تذکرہ

۷۔ شاہ عبدالعزیز، بستان المحدثین (ترجمہ: مولانا عبدالسمیع)، تمہید مصنف، مکتبہ مدینہ، دیوبند، ۲۰۰۱ء، ص ۱۱

۸۔ ماخذ سابق۔

کرتے ہیں۔ اگر کسی محدث کے شاگردوں نے اپنے طور پر ان کی کتاب کے الگ الگ نسخے تیار کیے تو ان کا بھی استقرائی انداز سے تذکرہ کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ وہ نسخہ کس شاگرد کا تیار کردہ ہے اور کہاں کہاں پایا جاتا ہے۔ اس کی واضح مثال امام مالک اور ان کی مؤطا کا تذکرہ ہے۔

بستان المحدثین کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ شاہ صاحب ہر کتاب کا تعارف اس کتاب کی پہلی حدیث ذکر کر کے شروع کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ثریا ڈار نے اس خوبی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''بستان المحدثین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شاہ صاحب نے ہر کتاب کا تعارف اس کی پہلی حدیث سے کرایا ہے اور اسے بعینہٖ اپنی تصنیف میں نقل کیا ہے''۔[9]

بستان المحدثین کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز نے جن علاقوں میں ان نامور محدثین کرام کی کتب احادیث کی شہرت ومقبولیت نقطۂ عروج کو پہنچی، ان کے نام بھی تحریر کئے ہیں۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر ''صحیح ابی عوانہ'' کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ صحیح ابی عوانہ کے بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں: "در مذہب شافعی بود و مذہب شافعی رااول کسے کہ دراسفرائن آورد" (وہ مسلکاً شافعی تھے اور پہلے شخص ہیں جو مذہب شافعی کو اسفرائن لائے)۔[10]

بستان المحدثین کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ شاہ صاحب نے اس میں کسی کتاب کے مجموعۂ حدیث کی تعداد کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگر کتب احادیث میں ثلاثی روایات موجود ہیں تو ان کی تعداد بھی بیان کی ہے۔ سنن ابو مسلم الکشی[11] سنن سعید بن منصور اور مصنف عبدالرزاق کو شاہ صاحب بہت اعلیٰ وارفع مقام دیتے ہیں اور اس کی وجہ وہ ان کتب میں ثلاثیات کی کثرت قرار دی ہے۔

بستان المحدثین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ شاہ صاحب نے اپنی اس کتاب میں محدث کے فقہی مسلک اور ذاتی رجحان ومیلان کو من وعن ظاہر کیا ہے۔ اور اس کا مقصد یہ بتایا ہے کہ لوگوں کو اس محدث کے مسلک اور رجحان کے بارے میں پتا چل جائے۔ مثلاً امام نسائی کے بارے میں فرماتے

۹۔ ماخذ سابق، شاہ عبدالعزیز اور ان کی علمی خدمات، ص ۲۶۵

۱۰۔ شاہ عبدالعزیز، بستان المحدثین (فارسی) ص ۳۷/ ترجمہ اردو عبدالسمیع، اصح المطابع وکارخانہ تجارت کتب، کراچی، ۱۳۳۴ھ، ص ۶۴

۱۱۔ ان کو الکجی بھی کہا جاتا ہے۔

ہیں: ''او شافعی المذہب بود، چناں چہ مناسک او بران دلالت می کند'' (وہ شافعی مسلک کے حامل تھے، چنانچہ ان کا طریق عبادت اس پر دلالت کرتا ہے)۔[12]

بہ ظاہر یہ مختصر کتاب دراصل فن معرفت علل حدیث، اسماء الرجال، علم نحو، فن تجوید اور علم ادب وشعر میں معروف محدثین کے احوال زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالتی ہے۔

''الیانع الجنی''، کے مصنف محمد محسن بن یحییٰ البکری، بستان المحدثین کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''منها كتابة بستان المحدثين، جمع فيه علوم الحديث مهذبة واختصرها'' (شاہ صاحب کی تصانیف میں ایک تصنیف بستان المحدثین ہے۔ اس میں انھوں نے علوم حدیث کو عمدہ اور مختصر انداز میں جمع کر دیا ہے۔)[13]

اسی اہمیت وافادیت کے پیش نظر اس کتاب کا اردو ترجمہ مولانا عبدالسمیع نے کیا جسے ہند و پاک کے مختلف اداروں نے شائع کیا۔ ابھی حال ہی میں مولانا راشد کاندھلوی نے اس کتاب کو اپڈیٹ کر کے ضروری معلومات، حواشی وغیرہ کے ساتھ اس کو ایک ضخیم بھرپور جلد[14] میں پیش کیا ہے۔

۱۲۔ ماخذ سابق، عبدالعزیز، بستان المحدثین (فارسی) ص ۱۱۱، اردو ص ۶۵

۱۳۔ الترہتی، محمد بن یحییٰ البکری التیمی، الیانع الجنی، اروقہ للدراسات والنشر، عمان، اردن، ۲۰۱۶ء، ص ۱۴۳

۱۴۔ دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث، بستان المحدثین (تصحیح، ترجمہ، حواشی اور اضافات: نورالحسن راشد کاندھلوی)، مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، مظفر نگر، یوپی، ۱۴۳۷ھ

جہانگیر کے کتب خانے کا نسخۂ تفسیر بیضاوی

ڈاکٹر عارف نوشاہی

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد

naushahiarif@gmail.com

یہ ستمبر-اکتوبر ۲۰۱۴ء میں میرا تاجکستان کا تیسرا سفر تھا، پہلے دو اسفار کی وجہ سے وہاں کے علمی لوگوں سے کچھ شناسائی پیدا ہو چکی تھی۔ ایک روز دارالحکومت دوشنبہ میں واقع قومی عجائب گھر، جسے وہاں آثار خانۂ ملّی کہتے ہیں، دیکھنے گیا۔ آثار خانہ کے ڈائریکٹر عبدالولی قربان علی وچ شریف اف سے کچھ سلام دعا تھی۔ انھوں نے ساتھ ہو کر مجھے عجائب گھر کی سیر کروائی۔ آخر میں مخطوطات کی گیلری میں لے گئے۔ گیلری میں پہنچنے سے پہلے ہی انھوں نے مجھے بتا دیا کہ وہاں ایک ایسا نسخہ ہے جو نورالدین محمد جہانگر بادشاہ (۱۰۱۴-۱۰۳۷ھ) کے کتب خانے میں رہا ہے۔ گیلری تک پہنچے تو شیشے کے ایک بہت بڑے شوکیس میں بند، اس نسخے کو اشتیاق اور حسرت سے دیکھا۔ میں نے ڈائریکٹر صاحب سے درخواست کی کیا وہ نسخہ شوکیس سے نکال کر دکھا سکتے ہیں تا کہ میں وہ عبارت دیکھ لوں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ، جہانگیر کے کتب خانے میں داخل رہا ہے۔ انھوں نے اپنے ایک ملازم کو بلا کر شوکیس کا تالا کھلوایا۔ ملازم شوکیس میں داخل ہوا۔ یہ منظر بہت دل چسپ تھا۔ شوکیس کے اندر جگہ تنگ تھی اور دیگر نسخے بھی پڑے ہوئے تھے۔ پاؤں رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ میرا مطلوبہ نسخہ شوکیس کے آخری کونے میں رکھا تھا۔ ملازم شیشے کی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک کونے سے دوسرے کونے تک، چپک چپک کر اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا گیا اور نسخہ نکال لایا۔ میں نے اس منظر کو تصویر بند کر لیا کہ بجائے خود تماشا تھا۔

یہ قاضی امام علامہ ناصرالدین ابوسعید عبداللہ بن عمر بیضاوی شافعی (متوفی: تبریز ۶۸۵ھ یا بقولے ۶۹۱ھ یا ۶۹۲ھ) کی معروف عربی تفسیر ''انوارالتنزیل واسرارالتاویل'' کا مخطوطہ (نمبر ۱۵۰۶۶) تھا، جسے عرف عام میں ''تفسیر بیضاوی'' کہتے ہیں۔ اس کے آخری صفحے پر وہ یادداشت موجود تھی جس کے

مطابق یہ نسخہ جہانگیر کے کتب خانے میں داخل رہا۔ نسخے کے سابقہ مالکوں کی کچھ اور یادداشتیں بھی دیکھیں جن کا تعلق پنجاب سے ہے۔ یہ سب یادداشتیں میرے لیے اہم تھیں۔ میں نے ان دو صفحات کی تصویر اتارنے کے لیے کیمرہ سنبھالا تو ڈائریکٹر صاحب نے منع کر دیا۔ یادداشتوں کو کاغذ پر نقل کرنا چاہا تو اس کی بھی اجازت نہ ملی۔ ناچار دونوں یادداشتوں کا مضمون اور اس میں درج اسماء کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا اور میوزیم سے ہوٹل پہنچتے ہی کاغذ پر لکھ لیا۔ بعد میں اس نسخے کی خبر اپنے سفرنامۂ تاجکستان میں شائع کر دی[1]۔

***

نومبر- دسمبر ۲۰۲۳ء میں ایک بار پھر تاجکستان جانا ہوا۔ تفسیر بیضاوی کا نسخہ میرے ذہن میں تھا۔ ایک روز پہلے سے طے کر کے آثار خانۂ ملیّ گیا۔ اِس بار انتظامیہ بدل چکی تھی۔ دروازے پر ایک خوش لباس، خوش اطوار نوجوان، موسیٰ زادہ محمد جان صلاح الدین نے استقبال کیا۔ یہ نوجوان شاید غائبانہ میرے نام اور مخطوطات کے حوالے سے میرے کسی کام سے واقف تھے لیکن میں انھیں نہیں جانتا تھا۔ یہ پوچھے بغیر کہ مجھے آثار خانۂ ملیّ میں کیا کام ہے، وہ سیدھا مجھے مخطوطات کی گیلری میں لے گئے اور قرآن کریم سے متعلق شوکیس سے نسخے دکھانے شروع کیے۔ قرآن مجید کے نسخوں کے بعد تفاسیر کی باری آئی تو سامنے تفسیر بیضاوی کا وہی نسخہ رکھا تھا اور وہی صفحہ کھلا تھا جس پر جہانگیر کے کتب خانے والی یادداشت ہے۔ اِس دفعہ میوزیم والوں نے ایک کام یہ کیا تھا کہ اسی صفحے کی تصویر بڑی کر کے گیلری میں بھی آویزاں کر دی تھی۔ میوزیم کے قوانین کی وجہ سے مَیں اِس دفعہ تصویر بنانے میں محتاط تھا، لیکن ڈرتے ڈرتے ہمت کر کے موسیٰ زادہ سے پوچھا: کیا میں اس مکبّر صفحے کی تصویر لے سکتا ہوں؟ اس نے کہا: بے شک۔ اور میں نے اس مکبّر تصویر سے دوسری تصویر بنا لی۔ اس کے بعد موسیٰ زادہ مجھے اپنے کمرے (دفتر) میں لے گئے اور میوزیم کے نسخوں کی بات چھڑ گئی۔ انھوں نے آثار خانہ کے منتخب نسخوں کی فہرست کا مسودہ دکھایا جو خود انھوں نے تیار کی ہے۔ اس فہرست میں تفسیر بیضاوی کے

۱۔ دیکھیے: عارف نوشاہی، از پنجاب تا پنجرود، ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۴۷۔ ۲۰۲۳ء کے سفر میں جب نسخے کو دوبارہ دیکھا اور تصاویر بھی حاصل کر لیں تو حافظے کی بنیاد پر لکھی گئی یادداشت میں سقم پایا۔ لہٰذا اب اس سے استناد نہ کیا جائے۔

نسخے کا نہ صرف تعارف درج ہے[۲] بلکہ انھی صفحات کی رنگین تصاویر بھی ہیں جو مجھے مطلوب تھے۔ میری درخواست پر موسی زادہ نے ان صفحات کی صاف تصاویر مجھے مہیا کر دیں جن کی مدد سے اب بہتر طور پر اس نسخے کا تعارف لکھا جا سکتا ہے۔

***

یہ نسخہ ماہ ذی الحجہ کے آخری جمعے، سال ۷۸۵ھ کو کتابت کیا گیا ہے۔ یہ آخری جمعہ ۲۴ ذی الحجہ کو پڑتا ہے جس کے مطابق عیسوی تاریخ ۱۶ دسمبر ۱۳۵۷ ہوتی ہے۔ کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا۔ یہ تفسیر کا پہلا نصف ہے اور ۲۱۶ ورق پر مشتمل ہے۔ نسخہ بخط نسخ ہے، سرخیوں کا اہتمام ہے۔ نسخے کے حاشیے پر مختلف قلموں سے متن سے متعلق بکثرت توضیحات اور دیگر یادداشتیں ہیں۔ ترقیمہ اس طرح ہے:

تمّ نصف انوار التنزيل فی اسرار التاويل[۳] فی يوم الجمعة الآخير من ذی الحجة لسنة ثمان و خمسين و سبعمائة. والحمدلله رب العالمين، والصلوة على رسوله محمد و آله الطيبين واصحابه الطاهرين. اللّهم اغفر لكاتبه و قارئه و طالبه و لمن نظر فيه و لمن دعا له بالخير ولكافة المسلمين اجمعين.

اس ترقیمے کے متصل، اس کے نیچے ایک فارسی یادداشت ہے جس کے مطابق شیخ عیسن قریشی نے اس تفسیر کے دونوں نصف، مبلغ نو (۹) روپے کے عوض میاں محمود ولد میاں داد ولد میاں ستّی، قوم کلال، ساکن کروڑ مخدوم سے خریدے تھے۔ یادداشت یہ ہے:

خرید و مالک شد این نیمۂ تفسیر با نیمۂ دوم ز میان محمود پسر میان داد پسر میاں ستّی، قوم کلال، ساکن کروڑ مخدوم. شیخ عیسن قریشی، مقابلۂ نہ روپیہ. نفعه الله تعالى بقرائته و اولاده به ابدالآبدين فی الدارين و عصمهم الله تعالى من كل آفة الدارين و قبل سعيهم بتكميل الناس، آمين آمين آمين ربّ العالمين.

۲۔ دیکھیے: موسی زادہ محمد جان صلاح الدین، فہرست منتخب نسخہ ہای دستنویس و کتاب ہای چاپ سنگی و آسناد نادر آثار خانہ ملی تاجکستان (عصر ہای ۱۴-۲۰)، دوشنبہ ۲۰۲۳ء، جلد ۱، ص ۲۲-۲۳

۳۔ کاتب نے کتاب کا نام انوار التنزیل فی اسرار التاویل لکھا ہے جب کہ درست نام انوار التنزیل و اسرار التاویل ہے۔ دیکھئے: حاجی خلیفہ، کشف الظنون، ذیل مادہ انوار التنزیل و اسرار التاویل

اس صفحے کی پشت پر اس نسخے کے سابق مالک میاں محمود کروڑی کی وہ عربی یادداشت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ پہلے امیر فتح اللہ شیرازی کی ملکیت میں تھا، پھر جہانگیر کے شاہی کتب خانے میں داخل ہوا۔ اس کے بعد آگرے میں بطور انعام محمود کروڑی کو منتقل ہوا۔ یادداشت یہ ہے:

هـذا الـجـلـد الـنفيس الاوّل من تفسير القاضى مِن متملكات استاد البشرعقل حادى عشـر نسخة السيادة امير فتح الله الشيرازى المعروف شاه فتح الله . دخل فى خزينة عامرة دار الـكتـب الـخليفة الغازى شاه نورالدين جهانگير بادشاه ثمّ انتقل لى برسم الانعام من حـضـرتـه بـالهبة الـحقيقه لا المجازى فى دار خلافه اگره صينت ووقيت عن الآفات مع سائر بلاد المؤمنين من ... وآخرا. ملكه شفيق الخلق محمود كرورى .

یادداشت کے ساتھ ہی نسخے کے حاشیے پر اسی قلم سے ایک فارسی قطعہ ہے جو غالباً اس نسخے کے بطور انعام ملنے کی تاریخ ہے۔ قطعے کے دوسرے بیت کی روشنائی پھیل گئی ہے اور یہ واضح نہیں ہے:

در غیبت من شاہ جہان نورالدین
دادست ہمین جلدو بمن راوی گفت
جستم زرای . . بہر او تاریخی
اول تفسیر قاضی بیضاوی گفت

اس یادداشت کے اوپر، نواب بہادر خان کے گھر کی تعمیر کا قطعہ تاریخ بھی درج ہے۔ اس قطعہ میں مادہ ''خانۂ عیش'' سے ۱۰۳۶ برآمد ہوتا ہے:

تاریخ بنای خانہ نواب بہادر خان کہ گفتہ شد

خان عالی ابوالمحمد بی
کہ برش دہر ملک تزئین کرد
ساخت کاخی چنانکہ مانی دہر
این چنین صورتی نہ در چین کرد
شہسواری کہ در ازل فلکش
خنگ اقبال را بروزین کرد

بہر آئین استراحت او
تختۂ گل گرفت و بالین کرد
جستم از اہل عیش تاریخش
''خانہ عیش'' گفت و تحسین کرد

یادداشت میں جس امیر فتح اللہ شیرازی کا ذکر ہوا ہے، وہ علوم نظری و عملی کا معروف عالم اور طبیب ہے۔ شیراز سے ہندوستان آ گیا تھا اور یہاں جلال الدین اکبر بادشاہ (۹۶۳-۱۰۱۴ھ) کا بہت خاص الخاص مقرّب اور مشیر رہا۔ اس کے انتظامی اور علمی کارناموں کا ذکر اُس دور کی اور مابعد کی تاریخوں: اکبرنامہ جلد سوم، منتخب التواریخ بدایونی، مآثر الامرا وغیرہ میں بتفصیل ملتا ہے۔ حکیم شیرازی کی وفات ۹۹۷ھ (۱۵۸۸-۱۵۸۹ء) میں کشمیر کے قریب ہوئی اور وہیں تخت سلیمان (بقول منتخب التواریخ) یا میر سید علی ہمدانی کی خانقاہ (بقول مآثر الامرا) میں دفن ہوا۔

جہانگیری دور کا حکیم فتح اللہ شیرازی بن حکیم لطف اللہ شیرازی کوئی دوسرا شخص ہے جس کا اس نسخے سے تعلق نہیں ہے۔ یہ حکیم، پہلے جہانگیر کا معتمد رہا پھر کسی خیانت کی وجہ سے معتوب ہوا۔ اس کا ذکر جہانگیر نامہ (توزک جہانگیری)، اقبال نامہ جہانگیری، مآثر جہانگیری، مجالس جہانگیری، منتخب التواریخ اور مآثر الامرا میں ملتا ہے۔

انوار التنزیل فی اسرار التاویل، آثار خانۂ ملی، دوشنبہ، نمبر ۱۵۰۶۶ کا ترقیمہ
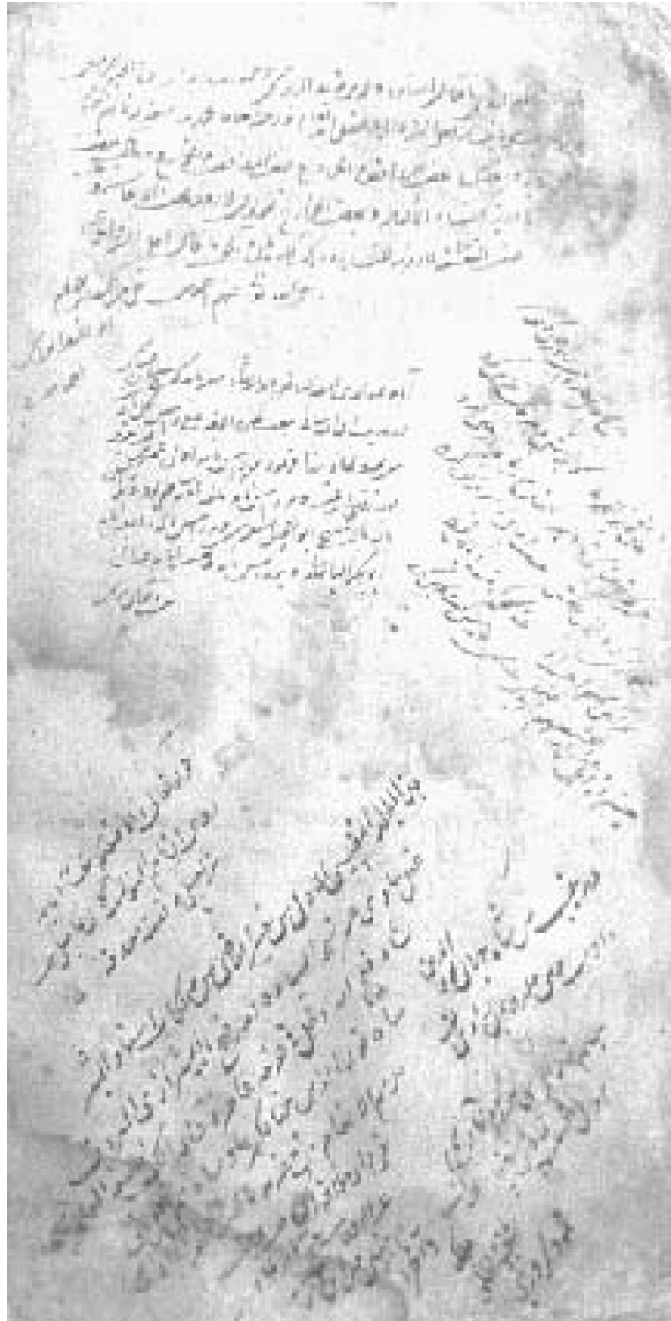
انوارالتنزیل فی اسرارالتاویل، آثار خانۂ ملی، دوشنبہ، نمبر ۱۵۰۶۶ صفحۂ آخر کی یادداشتیں

ہندوستان میں مستشرقین اور علوم اسلامی
ایک تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی

پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مغرب کے اہل قلم جب مشرقی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں، تو وہ استشراق کہلانے لگتا ہے۔ علمی دنیا کی یہ اصطلاح کچھ ایسا ہی مفہوم بیان کرتی ہے۔ لیکن استشراقی سرمایہ کا غالب ترین حصہ صرف، 'اسلام، اسلامی علوم و افکار اور مسلمانوں' سے تعلق رکھتا ہے، اور اسلام کے سوا مشرق کے دیگر مذاہب کو عموماً 'اپنا موضوع نہیں بناتا ہے[1]، اس لئے یہ کہنا غلط نہیں ہوسکتا کہ استشراق اسلام کے مغربی مطالعہ کا نام ہے۔

مغرب نے اسلام پر تصنیف اور مطالعہ کے کئی دور گذارے ہیں۔ آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر اب اکیسویں صدی تک یہ سلسلہ دراز بلکہ فزوں تر ہے۔ اس پورے دور کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے مغرب نے اندلس میں مسلم اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ بچھائے۔ پھر گیارہویں صدی میں صلیب و ہلال کی کشمکش کے بعد طویل عرصہ تک اسلام، قرآن اور سیرت نبوی کو غیر مہذب اور وحشیانہ ثابت کرنے کے جھوٹے الزامات اور علمی خیانتوں کے انبار لگاتے رہے۔ پھر سترہویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد مسلم ممالک کو استعمار کے شکنجہ میں لیتے ہوئے علمی سہولیات اور متعلقہ معلومات بہم پہنچا کر مسلم ذہن پر مرعوبیت قائم کی[2]۔ اور اب مابعد نوآبادیاتی دور میں علمی رنگ احترام دکھاتے ہوئے

۱۔ یہ درست ہے کہ انگریز مستشرقین نے ہندوستانی زبانوں اور قوموں کا مطالعہ کیا ہے، اسی طرح جرمن مستشرقین نے سنسکرت زبان اور قدیم ہندوستانی افکار و نظریات کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن اس کی مقدار محدود ہے۔ نیز ہندوستانی مذاہب مستشرقین کے مطالعہ کا حصہ نہیں رہے ہیں۔ دیکھئے: جائسی، علیم اشرف، تفہیم استشراق، دارالعلوم جائس، یوپی، اپریل ۲۰۱۸، ص ۲۱

۲۔ ۱۷۹۸ کے بعد نپولین نے مصر کا علمی خزانہ فرانس منتقل کر دیا، اسی طرح ۱۸۵۷ کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کا علمی سرمایہ لندن منتقل کر لیا۔ اور یوں مشرق میں اسلام کو علمی تہی دامن کر کے مغرب کو مالا مال کیا گیا۔

بھی تعصب اور جھوٹ آمیز ذہنیت کا تسلسل باقی رکھا ہے۔[۳]

ہندوستان میں استشراق: ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے باضابطہ استشراقی عمل کا آغاز یہاں ہوتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی شان و شوکت کو گہن لگنا شروع ہو گیا تھا، اور یورپی استعمار اپنے شکنجے مسلم ممالک پر کسنے لگے تھے، ہندوستان پر بھی برطانوی استعمار کے پنجے مضبوط ہونے لگے تھے۔ اسی دور میں یہاں سب سے پہلے ۱۷۸۴ء میں برطانوی مستشرق سر ولیم جونز (Sir William Jones ۱۷۴۶-۱۷۹۴) نے کلکتہ میں 'ایشیاٹک سوسائٹی' قائم کی، جس کا مقصد مشرقیات پر تحقیق کو بہتر بنانا، اور اس کی لائبریری میں ہندوستان کی قیمتی مخطوطات کو جمع کرنا تھا۔ ولیم جونز کو حکومت برطانیہ نے کلکتہ کے سپریم کورٹ کا جج مقرر کیا تھا۔ یہ ادارہ مستشرقین کی طرف سے قائم کئے جانے والے مشرقی مطالعات کے ابتدائی اداروں میں سے ایک ہے۔

علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:

> سب سے پہلے ہالینڈ نے اپنے مقبوضہ جزائر مشرقی میں ۱۷۷۸ میں ایک ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی، اس کی تقلید میں انگریزوں نے بہ مقام کلکتہ ۱۷۸۴ میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی اور ۱۷۸۸ میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، اس کے بعد ۱۷۹۵ میں فرانس نے مشرقی زندہ زبانوں

۳۔ نظامی، خلیق احمد، مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور، مقالہ مشمولہ اسلام اور مستشرقین، ترتیب: صباح الدین عبدالرحمٰن، جلد دوم، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۰۰۷۔ یہ حقیقت ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی مغرب کے مستشرقین کی بڑی اکثریت اسلام، قرآن اور پیغمبر اسلام ﷺ کے تعلق سے اسی نوع کے سارے جھوٹ، غلط بیانی اور دریدہ دہنی کا مظاہرہ کر رہے ہیں، جو ماضی میں ان کی شناخت رہی ہے۔ مثال کے طور پر حال میں اشاعت پذیر جین ڈیمن میک اولف کی انسائیکلوپیڈیا آف قرآن کی چار جلدوں میں، قرآن سے متعلق وہی غلط بیانی اور اتہامات بھرے ہیں جو سابق میں مستشرقین نے لگائے تھے، اور جن کی تغلیط خود بعض مستشرقین اور متعدد مسلم علماء نے مدلل طور پر کر دی تھی۔ اسی طرح موجودہ وقت کے متعدد مستشرقین جیسے پروفیسر ایلن جان وغیرہ کی تحریریں اسلام اور قرآن کے خلاف وہی گھسی پٹی پرانی جھوٹی باتوں پر مشتمل ہوتی ہیں، جن کے علمی جوابات سے مسلم علماء کی مدلل کتابوں کے انبار لگ چکے ہیں۔ اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے: قدوائی، عبدالرحیم پروفیسر، اسلام مغرب کی نظر میں، خلیق احمد نظامی سنٹر فار قرآنک اسٹڈیز، علی گڑھ۔

(عربی، فارسی، ترکی) کا دارالعلوم قائم کیا، اور آخر کار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درس گاہیں اور انجمنیں جاری ہوگئیں، عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا"[۴]۔

علامہ شبلی مزید لکھتے ہیں کہ:

کیپٹن اے میتھیوس نے ۱۸۰۹ میں کلکتہ سے مشکاۃ المصابیح کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا۔ اسی طرح ۱۸۵۶ میں وان کریمر نے کلکتہ سے واقدی کی کتاب المغازی طبع کرائی[۵]۔

اسی شہر کلکتہ میں ۱۸۰۰ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ ولیم کالج قائم کیا، جہاں سے اردو زبان وادب کے علاوہ عربی قواعد اور دیگر مذہبی کتابوں کی تحقیق واشاعت عمل میں لائی گئی۔

ہندوستان آنے والے مستشرقین: اس دور میں یورپ بالخصوص برطانیہ سے جو مستشرقین یہاں آئے اور اسلامی موضوعات کو اپنی تحقیق وتصنیف کا میدان بنایا، ان میں سے معروف اشخاص کا مختصر ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

۱۔ معروف آسٹریائی برطانوی مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر (Aloys Sprenger ۱۸۱۳۔۱۸۹۳) نے ۱۸۴۳ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو بحیثیت طبیب جوائن کیا، پھر ایک سال کے بعد وہ دہلی کالج (موجودہ ذاکر حسین کالج) کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۸۴۸ میں انھوں نے لکھنؤ کے شاہی کتب خانہ کا کیٹلاگ تیار کیا۔ ۱۸۵۰ میں ڈاکٹر اسپرنگر ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے وابستہ ہوگئے، کئی برس تک وہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے بھی پرنسپل رہے۔ ۱۸۵۶ میں اسی سوسائٹی سے انھوں نے اسماء الرجال کی معروف کتاب، ابن حجر عسقلانی کی 'الاصابہ فی احوال الصحابہ' پہلی بار شائع کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے جلال الدین سیوطی کی 'الاتقان فی علوم القرآن'، مسعودی کی کتاب 'مروج الذھب'، محمد علی تھانوی کی کتاب 'کشاف اصطلاحات الفنون' اور ملا کاشانی کی 'معجم اصطلاحات الصوفیہ' جیسی کتابوں کی تحقیق واشاعت انجام دی۔

۲۔ جرمن نژاد برطانوی مستشرق فرٹز کرنکو (Fritz Krenkow ۱۸۷۲۔۱۹۵۳) حیدرآباد آئے، اور طویل عرصہ تک دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے وابستہ رہے۔ یہاں انھوں نے علوم

۴۔ شبلی نعمانی، سیرت النبی، مقدمہ، ص ۶۶

۵۔ شبلی نعمانی، سیرت النبی، مقدمہ، ص ۶۷

اسلامیہ کی کتابوں کی تحقیق و اشاعت انجام دی، چنانچہ ابن ابی حاتم کی 'کتاب الجرح والتعدیل'، ابن حجر عسقلانی کی 'الدرر الکامنہ فی اعیان المأۃ الثامنہ، نیز ابونعیم اصفہانی کی 'حلیۃ الاولیاء' کی تحقیق اور اشاعت اس مستشرق کے ذریعہ مکمل ہوئی۔ یہ ۱۹۲۰-۱۹۳۰ کے دوران علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بھی استاذ رہے[۶]

۳۔ ہندوستان آکر استشراقی کام انجام دینے والے ایک مشہور مستشرق سر ولیم میور (William Muir ۱۸۱۹-۱۹۰۵) ہیں۔ ۱۸۳۷ سے ۱۸۷۶ تک وہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے وابستہ رہے۔ شمال مغربی صوبوں کے گورنر کے سکریٹری اور پھر لیفٹیننٹ گورنر، نیز رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے صدر رہے۔ ولیم میور نے دی لائف آف محمد شائع کی، جس میں انتہائی دل آزار اور جھوٹے اتہامات سے سیرت نبوی کے روشن صفحات کو داغدار کیا، جس کے جواب کے لئے سر سید احمد نے خطبات احمدیہ لکھی۔ اس کے علاوہ ولیم میور نے خلافت کے عروج وزوال پر اور اسلامی تاریخ پر بھی کتاب لکھی۔

۴۔ اسی دور سے تعلق رکھنے والی ایک معروف شخصیت سر تھامس واکر آرنلڈ (Sir Thomas Walker Arnold ۱۸۶۴-۱۹۳۰) کی ہے۔ آرنلڈ کی شہرت اس اعتبار سے بھی ہے کہ انھوں نے سرسید کی دعوت پر ۱۸۸۸ سے ۱۸۹۸ تک دس برس علی گڑھ کالج میں فلسفہ کی تعلیم دی، اس دوران علامہ شبلی کے ساتھ ان کی مصاحبت اور معاونت رہی۔ پھر یہاں کے بعد وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے استاذ ہوگئے جہاں علامہ اقبال نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۹۰۴ میں لندن واپس جاکر عربی اور اسلامک اسٹڈیز کے استاذ مقرر ہوگئے۔ سر آرنلڈ نے اپنی مشہور کتاب 'پریچنگ آف اسلام' لکھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے خلافت کی تاریخ پر کتاب لکھی، نیز انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں چند مقالات لکھے۔

۵۔ سر چارلس جیمس لائل (Chrles James Lyall ۱۸۴۵-۱۹۲۰) ۱۸۶۷ میں ہندوستان آئے، یہاں انھوں نے انڈین سول سروس جوائن کیا اور مختلف حیثیتوں سے کام کرتے رہے۔ وہ ۱۸۹۴ میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے بھی صدر رہے۔ انھوں نے عربی شاعری اور ادب کی متعدد کتابوں کی تحقیق وایڈیٹنگ اور اشاعت انجام دی[۷]۔

۶۔ موسوعۃ المستشرقین، ص ۴۷۳۔ المستشرقون، ص ۵۳۰

۷۔ عقیقی، نجیب، المستشرقون، دار المعارف مصر، ۱۹۶۴ء، ص ۴۹۷

۶۔ برطانوی مستشرق رچرڈ برٹن (Richard Francis Burton ۱۸۲۱۔۱۸۹۰) نے بمبئی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں آفیسر کے طور پر کام کیا۔ طویل عرصہ تک یہاں مقیم رہے۔ انھوں نے گلستان سعدی، اور 'الف لیلہ' کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ان کی شہرت اس طور پر زیادہ ہوئی کہ انھوں نے ۱۸۵۳ میں ایک مسلمان کا روپ دھار کر مرزا عبداللہ کے نام سے حرمین شریفین کا سفر کیا، اور اپنے تجربات پر مشتمل سفر نامہ (Personal Narrative of a Pilgrimage to El-Medinah and Meccah) تحریر کیا، جسے مغرب میں بہت وقیع کام سمجھا گیا[۸]۔

ان کے علاوہ ولیم لیز (۱۸۸۹)، جو کلکتہ کالج کے پرنسپل رہے، چارلس اسٹورے (۱۹۶۸)، جو علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر رہے، اور جوزف ہوروچ (۱۹۳۸)، جو علی گڑھ کالج میں عربی کے پروفیسر رہے، کے بھی تذکرے آتے ہیں۔

یہ چند وہ مستشرقین ہیں جنھوں نے خصوصیت کے ساتھ اسلامی مذہبی علوم سے دلچسپی لی، اور ان سے متعلق موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ ان کا تعلق برطانوی حکومت سے تھا، اور وہ استعمار کے دور میں اسلام سے متعلق علمی موضوعات پر قلم اٹھا رہے تھے۔ ان کے علاوہ چند اور بھی مستشرقین ہیں جنھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت ہندوستان میں قیام کیا اور یہاں علمی کام انجام دیے۔ چونکہ ان کے کاموں کا تعلق، اسلامی علوم کی بہ نسبت زبان وادب اور ہندوستانیات سے زیادہ ہے، اس لئے ان کا تذکرہ یہاں نہیں کیا گیا ہے۔

ہندوستان سے متعلق استشراقی کام: ہندوستان سے متعلق مستشرقین کے کاموں کی ایک دوسری نوعیت بھی ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے گو ہندوستان میں رہائش وسکونت اختیار نہیں کی لیکن ان کے کاموں کے دائرہ میں ہندوستان سے متعلق یا ہندوستان میں انجام پانے والے مسلمانوں کے علوم اور تصنیفات شامل ہیں۔ ایسے کچھ کام درج ذیل ہیں:

۱۔ اس نوعیت کے کاموں میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل لکھنؤ کی عالمی تبشیری کانفرنس ہے۔ یہ کانفرنس مشہور مستشرق صموئیل زویمر (Samuel Zwemer ۱۸۶۷۔۱۹۵۲) کی سربراہی میں لکھنؤ کے آئی ٹی کالج میں ۱۹۱۱ میں منعقد ہوئی، جس کے ایجنڈہ اور تجاویز میں اسلام کی نشر واشاعت

۸۔ عقیقی، نجیب، المستشرقون، دار المعارف مصر، ۱۹۶۴ء، ص ۴۸۶

روکنے، مسلمانوں میں تبشیری کام کرنے والوں کی تیاری، اور مسلمان عورتوں اور بچوں میں عیسائیت کی نشر واشاعت پر زور دینے جیسے مقاصد شامل تھے۔

۲۔ پروفیسر سخاؤ(Eduard Sachau ۱۸۴۵۔۱۹۳۰) معروف جرمن مستشرق ہیں، ان کے استشراقی کاموں میں یہ بھی شامل ہے کہ انھوں نے ابوریحان البیرونی کی 'کتاب الہند' (جس کا مکمل نام 'تحقیق ماللہند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل اومرذولۃ' ہے) کی تحقیق واشاعت انجام دی، نیز انھوں نے اسی مصنف کی کتاب 'الآثار الباقیۃ' کی تحقیق کی اور جرمن مقدمہ کے ساتھ اسے شائع کیا۔

۳۔ لوسین بوواٹ(Lucien Bouvat ۱۸۷۲۔۱۹۴۲) فرانسیسی مستشرق ہیں، انھوں نے مسلمانوں کی تاریخ پر کام کیا، اور متعدد کتابیں لکھیں۔ ان کی ایک کتاب 'مغل شہنشاہیت' ہے، ساتھ ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ پر مقالہ شائع کیا[9]۔

۴۔ مشہور فرانسیسی مستشرق پروفیسر نکلسن (Reynold A. Nicholson ۱۸۶۸۔۱۹۴۵) نے علامہ اقبال کی 'اسرار خودی' کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جس سے اقبال اہل یورپ میں بڑے پیمانہ پر متعارف ہوئے[10]۔

مسلم علماء اور استشراق: ہندوستان میں استشراق پر گفتگو کا اہم ترین حصہ یہ ہے کہ یہاں کے علما اور مسلم دانشوروں نے مستشرقین کے ذریعہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے مغرب میں انجام پانے والے ان کاموں کا جائزہ بھرپور طریقہ پر لیا، جو اسلام کے مصادر اور افکار وشخصیات سے متعلق تھے۔ بلکہ یہ کہنا بھی بجا ہوگا کہ اسلام اور بالخصوص سیرت نبوی سے متعلق مستشرقین کی غلط بیانیوں پر گرفت وعلمی محاسبہ، اردو زبان میں سب سے پہلے سر سید احمد خاں (۱۸۱۷۔۱۸۹۸) کے ذریعہ انجام پایا۔

سر سید احمد خاں: مولانا ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۳۔۱۹۹۹) نے لکھا ہے:

> سر سید پہلے شخص ہیں جن کے دل پر ایک چوٹ لگی اور ان کی مغفرت کے لئے یہ کافی ہے کہ جب وہ سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لئے لندن گئے اور وہاں سے انہوں نے محسن الملک کو جو خطوط لکھے

۹۔ جائسی، علیم اشرف، تفہیم استشراق، دارالعلوم جائس، یوپی، اپریل ۲۰۱۸ء، ص ۱۴۸

۱۰۔ عقیقی، نجیب، المستشرقون، دارالمعارف مصر، ۱۹۶۴ء، ص ۵۲۵

ان میں یہ بھی ہے کہ میرے ظروف، میرے گھر کے برتن فروخت کر کے مجھے پیسے بھیجے جائیں تاکہ میں یہ کام انجام دے سکوں۔ان کے ساتھ ان کے مددگار مولوی چراغ علی وغیرہ بھی تھے"[11]۔

ڈاکٹر نثار احمد نے لکھا ہے:

مستشرقین کے حوالہ سے بھی مطالعہ سیرت کا علمی محاذ بھی سب سے پہلے دراصل سرسید احمد خان نے ہی کھولا.......سرسید نے جذبہ ایمانی اور خالص جرأت رندانہ سے کام لے کر اپنے ہم عصر مستشرق سر ولیم میور کی دلآزار تصنیف دی لائف آف محمد (حیات محمد) کی اشاعت پر خاموشی کو گناہ کے برابر خیال کیا.....اور خالص علمی سطح پر میور کی کتاب پر تنقید و محاکمہ کر کے.....ایک جوابی کتاب 'الخطبات الاحمدیہ فی العرب و السیرۃ المحمدیۃ' لکھی، اور یوں انیسویں صدی کے اواخر سے گویا مستشرقین کے مقابلہ میں ایک جوابی علمی تحریک کا آغاز ہوگیا"[12]۔

علامہ شبلی نعمانی: سیرت کے حوالہ سے مستشرقین کے کاموں کا علمی جائزہ اور جواب پر سب سے وقیع اور مفصل کام علامہ شبلی (۱۸۵۷۔۱۹۱۴) نے انجام دیا ہے، اپنی مایہ ناز تصنیف سیرت النبی میں انھوں نے موقع بہ موقع مستشرقین کی علمی خیانتوں، غلط بیانیوں اور غلط استدلال پر گرفت کی ہے، کتاب کے مفصل مقدمہ میں انھوں نے 'یوروپین تصنیفات' کے نام سے سیرت پر مستشرقین کی تمام تصنیفات کا جائزہ لیا ہے اور ۳۸ کتابوں کی فہرست بنا کر ان کا علمی محاسبہ کیا ہے، اور اس حوالہ سے مستشرقین کی بھی علمی درجہ بندی کی ہے۔

علامہ شبلی نے سیرت النبی ﷺ کے علاوہ اپنی متعدد تصنیفات اور مقالات میں مستشرقین کے اعتراضات کے مدلل جواب دیے، اور ان کی غلطیوں کو واضح کیا۔ ان میں مستشرق جرجی زیدان (۱۸۶۱۔۱۹۱۴) کی 'تاریخ التمدن الاسلامی' کی اغلاط کی تردید پر 'الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی' لکھی، ان کتابوں کے علاوہ ان کی رسائل اور مقالات میں 'گذشتہ تعلیم'، 'جزیہ'، 'حقوق الذمیین' اور 'کتب خانہ اسکندریہ' وغیرہ میں مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط باتوں اور غلط فہمیوں کا مضبوط علمی رد کیا۔

علامہ پیر کرم شاہ ازہری: مولانا ازہری (۱۹۱۸۔۱۹۹۸) نے سیرت نبوی کے موضوع پر اپنی معروف

۱۱۔اسلام اور مستشرقین، جلد اول، ص ۲۲

۱۲۔اسلام اور مستشرقین، جلد سوم، ص ۸۶

کتاب 'ضیاء النبیؐ' کی چھٹی اور ساتویں جلدوں میں مستشرقین کے اعتراضات کا مفصل جائزہ لیا ہے اور تفصیلی جوابات دیے ہیں، اور مستشرقین کی غلط بیانیوں اور غلط استدلال کو طشت از بام کیا ہے۔ مولانا کی دوسری کتاب 'سنت خیر الانام' میں بھی اس موضوع پر گفتگو کی گئی ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ: ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۱۹۰۸-۲۰۰۲) ایک معروف علمی نام ہے، استشراق کے حوالے سے ان کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ وہ بقول پروفیسر خورشید احمد مسلمانوں میں پہلے اور آخری مستشرق تھے۔ انھوں نے مستشرقین ہی کے منہج اور اسلوب میں ان کی بنیادی غلطیوں کی تردید کی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی کتاب 'الوثائق السیاسیه للعهد النبوی و الخلافة الراشدة' اور ان کی تحقیق سے شائع شدہ کتابیں 'صحیفہ ہمام بن منبہ' اور 'سیرت ابن اسحاق' وغیرہ مستشرقین کے اعتراضات کی بنیادوں ہی کو منہدم کر دیتی ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی: مولانا ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۳-۱۹۹۹) کی نظر مستشرقین کے کاموں پر گہری تھی، اور اس بات کا عمیق احساس تھا کہ ان کی پھیلائی ہوئی غلط بیانیوں کا جواب اسی اسلوب اور علمی انداز میں دیا جائے، جو ان کی شناخت ہے اور مغرب کی زبانوں میں یہ جوابات شائع کئے جائیں۔ ان کی کتاب 'اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین' اس حوالے سے اہم علمی کتاب ہے۔ مولانا علی میاں کا احساس ہے کہ:

> جن چار ملکوں کا آمنا سامنا مغربیت سے ہوا، وہ ترکی، مصر، ہندوستان اور ایران ہیں۔ ان ملکوں میں مغربی زبانوں میں ہمارے مسلم فضلا کو بہت بڑا کام کرنا تھا، یہ فرض عین تھا، فرض کفایہ نہیں..... لیکن افسوس ہے کہ جہاں تک میں واقف ہوں کہ کم سے کم ترکی، مصر اور ایران میں یہ کام بہ قدر ضرورت بھی نہیں ہوسکا [۱۳]۔

ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی: ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی (۱۹۳۲-۲۰۱۷) کا تعلق ہندوستان سے ہے، گو کہ انھوں نے مغرب اور عرب میں بیٹھ کر علمی کام انجام دیے۔ ان کا کام مستشرقین کے علمی جواب کے لئے بہت معیاری اور محققانہ ہے۔ 'دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینه' اب ایک مستند حوالہ اور مستشرقین کے کئی اعتراضات کی بنیادوں کو ختم کر دینے والی تحقیق ہے۔

۱۳۔ اسلام اور مستشرقین، جلد اول، ص ۲۰

ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی: معاصر دور کی شخصیات میں مستشرقین کے قرآنی کاموں بالخصوص تراجم قرآن پر گہری اور بصیرت افروز نظر رکھنے والی شخصیت ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی (اکتوبر: ۱۹۵۶) کی ہے۔ آپ اس وقت اس موضوع پر دنیا بھر میں اپنی مستند علمی شناخت رکھتے ہیں۔ انگریزی اور اردو میں آپ کی قیمتی تحریریں اور کتابیں اس حوالے سے شائع ہو چکی ہیں، جن میں مستشرقین کے تراجم قرآن بالخصوص انگریزی تراجم قرآن کا علمی جائزہ لیا ہے اور ان کی اغلاط بلکہ تحریفات کو واشگاف کیا ہے۔ ان کی کتابوں میں Bibliography of the Translations of the Meanings of the Glorious Qur'an into English, 1649-2002: A Critical Study, اور Translating the untranslatable: A Critical Guide to 60 English Translations of the Quran, نیز 'مستشرقین اور انگریزی تراجم قرآن'، اور 'اسلام اہل مغرب کی نظر' میں قابل ذکر ہیں۔

ان اہم شخصیات کے علاوہ متعدد دیگر اور بھی مسلم اہل علم اور محققین نے علمی تحقیقات کے ذریعہ استشراق کے موضوع کا جائزہ لیا اور علمی جوابات دیے ہیں۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ: ہندوستان میں استشراق کے حوالے سے دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کی خدمات انتہائی قابل قدر ہیں۔ ۱۹۸۲ میں دارالمصنفین نے اسلام اور مستشرقین کے عنوان سے عالمی سطح کا بڑا معیاری سیمینار منعقد کیا تھا، جس میں اس وقت پوری دنیا سے وہ نامور اہل علم اور مصنفین شریک ہوئے تھے، جنھوں نے استشراق کے موضوع سے دلچسپی لی تھی۔ اس سیمینار کے مقالات اور علمی روداد 'اسلام اور مستشرقین' کے نام سے پانچ جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔

موجودہ وقت کی صورت حال اور ضرورت: موجودہ وقت کی صورت حال یہ ہے کہ استشراقی مطالعات اور تصنیفات کا سلسلہ بدستور جاری ہے، اور ان تصنیفات میں اسلام اور اسلامی شخصیات و مقدسات کے حوالے سے وہی پرانے اعتراضات اور گھسی پٹی جھوٹی باتوں کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔ ایسی تحریروں اور افکار کی بازگشت اور گونج ہمارے ملک ہندوستان میں پوری قوت سے سنائی دے رہی ہے۔ مغربی دانشگاہوں اور تحقیقی اداروں سے شائع ہو رہی تصنیفات میں سابق کے ان مستشرقین کی باتوں اور اعتراضات ہی کو دہرایا جا رہا ہے، جن کی غلطی مسلم اہل علم نے مدلل طور پر واضح کر دی ہے۔

ان کا منہج اس نئے دور میں بھی، اسی غلط راہ پر رائج ہے کہ وہ اعتراضات کے دلائل کے لئے اپنے پیشرو مستشرقین کی ان تحریروں پر اعتماد کرتے ہیں اور ان سے اقتباسات لیتے ہیں، جو خود بے بنیاد اور علمی خیانت پر مبنی ہیں۔ اس سلسلہ میں معروف مثال ابھی ۲۰۰۱ سے ۲۰۰۶ کے درمیان مستشرقہ جین ڈیمن میک اولف (Jane Dammen McAuliffe پ: ۱۹۴۴) کی زیر ادارت حال میں شائع ہونے والی 'انسائیکلو پیڈیا آف قرآن' ہے۔ ڈاکٹر مظفر اقبال نے اس قاموس کی علمی غلطیوں کے محاسبہ کے لئے دوسری انسائیکلو پیڈیا بنام 'انٹگریٹیڈ انسائیکلو پیڈیا آف قرآن' کے نام سے شائع کرنا شروع کیا ہے۔ اسی طرح یونیورسٹی آف اوکسفورڈ سے وابستہ معاصر مستشرق پروفیسر ایلن جان (Alan Jones ۱۹۳۳۔۲۰۲۱) نے قرآن کا ترجمہ اور تفسیر پیش کی ہے، اور اس میں وہی سابق الزامات اور غلط بیانیوں کا اعادہ کیا ہے۔ اس کا جائزہ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے علمی اسلوب میں مدلل طور پر لیا ہے۔

اس بات سے کسی صاحب نظر اور صاحب علم کو اختلاف نہیں ہوگا کہ اس وقت مغرب کی علمی دانشگاہوں سے اسلامی علوم اور افکار و تاریخ سے متعلق بے شمار کتابیں شائع ہو رہی ہیں، اور ان کا غالب حصہ اسلام کے بنیادی مصادر سے دور رہ کر اسلام کی غلط تصویر کشی اور غلط بیانی پر مبنی ہے۔ لیکن ان کے علمی جائزہ کا کام اس تناسب سے اور اس علمی معیار پر بالکل نہیں ہو رہا ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ۱۹۸۲ کے دارالمصنفین کے عالمی سیمینار کے بعد کوئی بڑا سیمینار اس حوالے سے نہیں منعقد کیا جا سکا ہے۔ چند انفرادی کاموں کے علاوہ اس موضوع کو باضابطہ منصوبہ بند مقصد نہیں بنایا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس موضوع پر کام کے لئے منصوبہ بندی کی جائے اور اس کے مطابق کام انجام دیے جائیں۔

مولانا فاروق خاںؒ کی ایک علمی یادگار ''کلام نبوت''

حدیث کی اردو ترجمانی وتشریح کا ایک منفرد مجموعہ

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

zafarul.islam@gmail.com

کچھ شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں جن سے ملاقات کی نوبت کم ہی آتی ہے، لیکن ان کی کتابیں یا تحریریں ایسی جاذبِ نظر، اثر انگیز اور دل و دماغ میں نقش کر جانے والی ہوتی ہیں کہ ان کو قریب رکھنا معمول بن جاتا ہے اور بار باران کو پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اس طرح کے اصحابِ قلم سے ملاقات کے مواقع کم نصیب ہونے کے باجود بار باران کی کتابیں پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنفِ موصوف سامنے ہیں اور کتاب پڑھنے والا ان سے باتیں کر رہا ہے۔ کسی کا خط پڑھنے کو'' نصف ملاقات'' سے تعبیر کرنا پرانی کہاوت ہے، واقعہ یہ کہ کسی کی کتاب پڑھنے پر بھی اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ کسی کی دل پسند کتاب پڑھتے ہوئے صاحبِ کتاب کا سراپا نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے، اس کی یادوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ہندی و اردو کے معروف مترجمِ قرآن، ممتاز اسکالر و دانشور اور سابق صدر ادارہ تحقیق وتصنیفِ اسلامی علی گڑھ مولانا محمد فاروق خاں (۱۷رجولائی ۱۹۳۲ء۔ ۲۸رجون ۲۰۲۳ء) ناچیز کے لیے ایسی ہی یادگار شخصیات میں سے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی وفات بھی سورہ لقمان کی آیت ۳۴ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ کوئی شخص نہیں جانتا کہ کس سرزمین میں اس کی موت آئے گی کی مصداق بنی۔ ۱۹۷۰ء میں مرکز جماعت اسلامی ہند کے رام پور سے دہلی منتقل ہونے کے بعد مولانا محترم کی حیاتِ مستعار کا زیادہ حصہ دہلی میں گزرا، عیدِ اضحیٰ سے ایک روز قبل (۲۸رجون ۲۰۲۳ء کو) وہ

اپنے صاحب زادے (طارق انور خاں) کے یہاں لکھنؤ تشریف لے جاتے ہیں اور اسی دن شام کو وہیں ان کا وقتِ موعود آ گیا۔ لکھنؤ سے ''کرپی'' (سلطان پور ضلع میں مولانا مرحوم کا گاؤں) قریب ہونے کی وجہ سے دنیا میں آخری آرام گاہ انہیں اپنے گاؤں کی سرزمین میں نصیب ہوئی، یعنی ''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ سچ یہ کہ اللہ رب العزت ہی جانتا ہے کہ کون سا مقام کس شخص کا مدفن بنے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَ یَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّهَا وَ مُسۡتَوۡدَعَهَا ؕ کُلٌّ فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ (هود ۶/۱۱:)[اور وہی اس کا (یعنی ہر جان دار کا) ٹھکانا اور مقامِ سپردگی جانتا ہے، سب کچھ کتابِ مبین (لوحِ محفوظ) میں درج ہے]۔

مولانا مرحوم کی تعلیمی زندگی کا یہ پہلو سبق آموز ہے کہ انہوں نے کسی مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم نہیں حاصل کی، نہ ہی کسی عالم کے انفرادی مرکزِ تدریس سے وابستہ ہوکر اسلامی و مشرقی علوم کی تحصیل کی۔ اپنے نانہال (مصورن، ضلع سلطان پور) کے مکتب میں ابتدائی تعلیم کے بعد وہیں قریب کے اسکول سے ہائی اسکول تک کے مراحلِ تعلیم ۱۹۵۲ء میں طے کئے اور اس کے بعد انہوں نے موضع کوہنڈہ (اعظم گڑھ) کے مدرسۂ دینیات میں تدریس کی خدمت اختیار کر لی جو علمی لحاظ سے ان کے لیے بارآور ثابت ہوئی۔ ان کی یہ مصروفیت تقریباً دس برس جاری رہی۔ مدرسہ میں تدریس کے لیے ان کے ذمے ہندی زبان اور عصری علوم کے مضامین تھے۔ تدریسی خدمت سے وابستہ ہونے کے باوجود مزید تعلیم کی طلب، دینیات پڑھنے اور عربی و فارسی زبان سیکھنے کی آرزو اور مذہبی معلومات میں اضافہ کی تمنا ان کے دل میں موجزن رہی۔ موقع کو غنیمت جانتے ہوئے انہوں نے مدرسہ کے اساتذہ میں خاص طور سے مولانا غالب احسن اصلاحیؒ (م: ۱۶ رمئی ۱۹۸۷ء) اور مولانا اقبال احمد قاسمیؒ سے کسبِ فیض کا سلسلہ شروع کیا اور فریضۂ منصبی کی ادائیگی سے جو کچھ وقت بچتا اسے وہ علم کی پیاس بجھانے میں لگا دیتے، بقول مدرسۂ دینیات کے ایک قدیم طالب (احسان احمد) تعلم و تعلیم کا یہ سلسلہ دیر رات تک جاری رہتا تھا۔ انہوں نے مدرسہ کے اپنے مخلص رفقاء سے خاص طور سے عربی زبان و ادب اور قرآن کی تعلیم حاصل کی تھی[1]۔ اس طرح مدرسۂ دینیات سے وابستگی کے دوران مولانا مرحوم نے عربی زبان اچھی طرح سیکھ لی اور دینی معلومات بڑھا لی۔ بعد میں انہوں نے کسی موقع پر یہ تاثر ظاہر کیا تھا کہ ''عربی زبان

۱۔ سکندر علی اصلاحی، مولانا محمد فاروق خاںؒ، سہ ماہی دعوت القرآن، لکھنؤ، جولائی۔ستمبر ۲۰۲۳ء، ص ۲۰۱-۲۰۲

جانے بغیر دین کی گہرائیوں اور رموز سے واقفیت ناممکن سی ہے"[۲]۔ مدرسہ کے اساتذہ سے استفادہ کے علاوہ مولانا مرحوم کو ہنڈہ گاؤں میں جن اہلِ علم کی صحبتوں سے مستفید ہوتے رہے ان میں نامور عالم مولانا وحید الدین خاںؒ (م:۲۱ر اپریل ۲۰۲۱ء) بھی شامل تھے جو اس گاؤں میں رشتہ مصاہرت کی وجہ سے آتے جاتے رہتے تھے۔

پچاس کی دہائی کے آخر میں مرکز جماعت اسلامی ہند کی طلب پر وہ ہندی میں ترجمۂ قرآن کی تالیف وترتیب اور اشاعت کے پروجکٹ سے وابستہ ہوئے اور اس مقصد سے وہ ایک طویل عرصہ تک رام پور میں قیام پذیر رہے۔ ان کی خوش نصیبی تھی کہ یہاں انہیں قرآن کے دو ممتاز عالم مولانا صدرالدین اصلاحیؒ (م:۱۳ر نومبر ۱۹۹۸ء) اور مولانا امانت اللہ اصلاحیؒ (م:۱۹ر مارچ ۲۰۱۹ء) سے استفادہ کا موقع میسّر ہوا۔ ان ماہرین قرآنیات سے مستفیض ہونے کے ساتھ مطالعۂ کتب (جو ان کا محبوب مشغلہ تھا) بھی جاری رہا۔ انہوں نے ماہرِ علوم قرآنی مولانا حمید الدین فراہیؒ (م:۱۹۳۰ء) کی کتابوں کے مطالعہ میں خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ ان سب سرگرمیوں بالخصوص متعدد ممتاز علمائے قرآن سے استفادہ کے فیض سے قرآن کریم سے ان کا تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوگیا، یہاں تک کہ بقیہ زندگی میں قرآن ہی ان کے فکر وعمل کا محور بن گیا۔ ان سب کے ساتھ ان کی علمِ دین اور دعوتِ دین کی خدمت بھی جاری رہی۔ دینی تعلیم سے فیض یابی کے شوقِ فراواں کا یہ عالم تھا کہ عملی زندگی کی مصروفیات سے منسلک ہونے کے بعد بھی ان کے دل میں مزید دینی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش اٹھتی رہی اور ایک بار تو انہوں نے ایک معروف مدرسہ میں باقاعدہ داخلہ لے کر دینی تعلیم مکمل کرنے کا ارادہ کرلیا تھا، لیکن کبھی حالات کا دباؤ اس میں مانع بنا رہا، اور کبھی جماعت کے مفوضہ اہم کاموں کی انجام دہی کی مصروفیت میں وہ اس کے لیے فرصت نہ پاسکے۔ مولانا مرحوم کی علمی تشنگی کا اندازہ کیجیے کہ وہ دور ہی نہیں ہوتی تھی، درحقیقت وہ علم (چاہے قدیم ہو یا جدید اور جس ذریعہ سے بھی حاصل ہو) کے متوالے تھے۔ چنانچہ اسی دوران انہوں نے پرائیویٹ طور پر بی۔اے اور ایم۔اے (ہندی) کے امتحانات پاس کیے اور عصری علوم کے مضامین میں خاص طور سے ہندی کے ماہر بن گئے۔ ایک روایت کے مطابق رام پور

۲۔ ابوالاعلیٰ سید سبحانی، مطالعات، مشاہدات، تجربات۔ ایک نشست معروف اسلامی دانشور مولانا محمد فاروق خاں کے ساتھ، القلم پبلیکیشنز، بارہمولہ، کشمیر، ۲۰۱۷ء، ص ۶

میں قیام کے دوران ہی انہوں نے ایک غیر مسلم اسکالر سے سنسکرت زبان بھی سیکھ لی تھی۔ دوسری جانب انگریزی زبان میں اپنی صلاحیت کو بڑھانے ومضبوط کرنے کے لیے بھی وہ کوشاں رہے اور اس کی خاطر ذاتی مطالعہ وممارست کے علاوہ واقف کاروں سے رہنمائی حاصل کرتے رہے۔ بایں طور مولانا مرحوم نے عملی زندگی کی ہما ہمی کے ساتھ تعلم سے بھی اپنا رشتہ بدستور قائم رکھا، اور بتوفیقِ الٰہی عربی و فارسی اور اسلامی علوم میں حصولِ مہارت کے ساتھ عصری علوم کے بعض شعبوں میں بھی ان کی صلاحیت واستعداد پروان چڑھتی رہی جو علم اور ملت وملک کی خدمت کے لیے بڑی مفید ثابت ہوئی۔ حقیقت یہ کہ مولانا کی علمی زندگی اور دعوتِ دین کی سرگرمیوں میں ان صلاحیتوں کے بہترین مظاہر سامنے آئے جن کا سب سے اہم پہلو قرآن وحدیث کے پیغام کو زبانی وتحریری طور پر عام کرنا تھا۔ بلا تکلف کہا جاسکتا ہے کہ مولانا محمد فاروق خاںؒ زندگی کے بیشتر حصے میں علوم ومعارف کے ان دونوں بحرِ زخّار میں غوّاصی کرتے رہے اور ہدایتِ الٰہی اور حکمتِ نبوی ﷺ کے موتی ومرجان نکال کر ان سے اپنی دنیائے فکر وعمل جگمگاتے رہے اور دوسروں تک بھی اس کی جگمگاہٹ پہنچاتے رہے۔

مولانا محمد فاروق خاں کی بیشتر تصانیف وتراجم قرآن وحدیث سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی مطبوعہ کتابوں میں کچھ اہم یہ ہیں: ہندی ترجمۂ قرآن، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے اردو ترجمۂ قرآن مع حواشی کا ہندی ترجمہ، آسان ترجمۂ قرآن، قرآن مجید کا صوتی اعجاز، قرآن مجید کے ادبی محاسن، شاہ عبد القادرؒ کی قرآن فہمی، قرآن کے تدریسی مسائل، نماز دین کا جامع عنوان، آخرت کے سائے میں، حقیقتِ نبوت، ہندی میں احادیث کا منتخب مجموعہ، علمِ حدیث۔ ایک تعارف، مطالعۂ حدیث، آنحضور ﷺ کی دعائیں، انتخابِ حدیث قدسیہ (مع ترجمہ وتشریح)، حکمتِ نبوی احادیث کی روشنی میں، ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کی تاریخ اور معالم الطریق (مصنفہ سید قطب شہید)، المستقبل لہذا الدین (سید قطب شہید) اور رسالہ دینیات (مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی) کے ہندی ترجمے۔ مولانا مرحوم کی تحریروں کا ایک قابلِ قدر پہلو یہ ہے کہ ایک جانب ان کے توسط سے وہ قرآن وحدیث کے پیغام کو برادران اسلام تک پہنچاتے رہے اور دوسری جانب آسان اسلوب میں اپنی ہندی نگارشات کے ذریعہ برادرانِ وطن کو اس پیغامِ رحمت سے اس دعوت کے ساتھ متعارف کراتے رہے کہ دینِ برحق ایک نعمت ہے، اس سے قریب ہو کر اور فائدہ اٹھا کر تو دیکھیں۔

مولانا محمد فاروق خاں کی حدیث سے متعلق کتابوں میں جس کتاب نے اس ناچیز کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ زیرِ تعارف ''کلامِ نبوت'' ہے۔ سچ یہ ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا دن گذرتا ہو کہ جس میں اردو کی بعض معروف تفاسیر کے علاوہ حدیث کی اس پسندیدہ شرح سے اس راقمِ عاجز نے استفادہ نہ کیا ہو۔

زیرِ مطالعہ کتاب کا قدیم ایڈیشن پانچ جلدوں پر مشتمل تھا۔ اب نئی ترتیب کے مطابق یہ کتاب سات جلدوں میں شائع ہورہی ہے۔ نئی ترتیب میں موضوعات اس طور پر تقسیم کیے گئے ہیں:

جلد اول۔ اساسی افکار وعقائد (اللہ پر ایمان، ایمان بالقدر، عقیدۂ رسالت، کتاب پر ایمان، عقیدۂ آخرت، ایمان واسلام)۔

جلد دوم۔ عبادات وروحانیت (اسلامی عبادات، دعاء، نبی کریم ﷺ کی بعض دعائیں، اللہ کا ذکر، اعتدال کی راہ)۔

جلد سوم۔ معاشرت (سماجی زندگی کے کچھ احکام وآداب، اسلامی تہذیب وثقافت)۔

جلد چہارم۔ اسلامی نظامِ معیشت، سیاست وحکومت، اظہارِ دین۔

جلد پنجم۔ دینِ حق، دعوتِ دین، حدیثِ رسول اور ہماری زندگی، خوش تر آں باشد، بہترین چیزیں، صورت خرابی کی۔

جلد ششم۔ اخلاق (اخلاقیات، مکارمِ اخلاق)

جلد ہفتم۔ رذائلِ اخلاق (عدم بصیرت، بدذوقی، ذلت وپستی) اجتماعی مفاسد (عدم بصیرت، بدذوقی، گراوٹ وپستی)، خلقِ عظیم (آپ ﷺ، اوصافِ حمیدہ، عظمت ووقار، آپ ﷺ کیسے تھے؟)۔

پہلی جلد کے دیباچہ میں مؤلف نے ''کلامِ نبوت'' کا مقصدِ تالیف یوں واضح کیا ہے: ''اب تک اردو زبان میں حدیث کے مختلف مجموعے شائع ہو چکے ہیں، پھر بھی عرصہ سے احادیث کے ایک ایسے انتخاب کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی جس میں اسلام کو ایک مکمل فلسفۂ حیات اور نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہو۔ حدیث کا یہ انتخاب جسے ہم ''کلامِ نبوت'' کے نام سے ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں اسی ضرورت کو پیشِ نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے''[۳]۔ حقیقت یہ کہ اس کی تمام جلدیں اس بات کی شہادت دے رہی ہیں کہ مولانا محمد فاروق خاں

۳۔ کلامِ نبوت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، ۱/۷

مرحوم نے اس مقصد کی تکمیل کی پوری کوشش کی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن (مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی) جولائی ۱۹۷۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔

زیرِ تعارف کتاب ''کلامِ نبوت'' مختلف پہلوؤں سے منفرد خصوصیات کی حامل ہے۔اس کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ مؤلفِ محترم نے ہر جلد کا مقدمہ تفصیل سے اس کے موضوع کے اعتبار سے رقم کیا ہے۔ پہلی جلد کے مقدمہ میں حدیث سے متعلق بنیادی امور (حدیث کی اہمیت، حفاظتِ حدیث، اشاعتِ حدیث، جرح وتعدیلِ حدیث یا حدیث کے جانچنے و پرکھنے کے اصول، کثیر الروایات صحابۂ کرامؓ کا تذکرہ، حدیث کے اولین تحریری مجموعے) زیرِ بحث آئے ہیں۔ ان امور پر سیر حاصل بحث کی اہمیت وافادیت کے علاوہ ۱۸ صفحات پر مشتمل یہ مقدمہ درحقیقت مولف کے تحقیقی ذوق کا بھی آئینہ دار ہے۔ مولانا مرحوم کی ایک دوسری کتاب (علمِ حدیث۔ ایک تعارف) میں علمِ حدیث اور اصولِ حدیث کے مباحث مزید مفصل انداز میں ملتے ہیں۔ پہلی جلد کے ابتدائی حصے میں مولانا مرحوم کی ایک منفرد تحریر ''حدیث کا ادبی مقام'' کے عنوان سے ہے۔ یہ تحریر اپنے موضوع پر منفرد ہونے کے علاوہ شعروادب میں مولانا کی گہری دلچسپی اوران کے ادبی ذوق کی بھی غماز ہے۔ کلام نبویﷺ میں جوادبیت اور فصاحت وبلاغت جلوہ گر ہے اس پر فاضل مولف کا یہ تاثر قابلِ نقل ہے:

> فصاحت وبلاغت میں کلام اللہ کے بعد کلامِ نبوت کا مقام ہے۔ نبی ﷺ کے ارشادات میں نہ صرف یہ کہ بلاغت وعبقریت کی شان نمایاں ہے، بلکہ ان میں الہام کا اثر بھی واضح طور پر محسوس ہوتا ہے جس کی وجہ سے سرمایۂ ادب میں ان کو ایک انفرادیت حاصل ہے۔ آپ ﷺ کا کلام ہر قسم کے تکلف وتصنع سے یکسر پاک ہے، ان کا ناپسندیدہ سجع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے جو الفاظ ادا ہوئے ہیں ان میں معانی ومطالب کی بڑی وسعت اور بلندی پائی جاتی ہے[۴]۔

اس ضمن میں مزید اہم بات یہ کہ مولف نے متعدد احادیث کے متن نقل کر کے کلامِ نبویﷺ کی ادبی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہوئے ان کی فصاحت وبلاغت کے کچھ عمدہ نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

یہ بتانے کے لیے کہ قیامت کی گھڑی نہایت قریب آگئی ہے (نبی کریمﷺ نے) فرمایا:

۴۔ کلامِ نبوت، ماخذ سابق ۱/۳۱

بعثتُ فِی نَفَسِ السَاعَةِ [۵] میری بعثت ایسے وقت ہوئی ہے جب کہ قیامت سانس لے رہی ہے''۔ مطلب یہ کہ قیامت کی گھڑی اتنی قریب آ گئی ہے کہ جیسے اس کے سانس لینے کی آواز سنائی دینے لگی ہو۔ اس تعبیر میں جو بلاغت ہے ظاہر ہے۔ حضور ﷺ نے استعارہ یا تمثیل (Personification) سے کام لیا ہے، جس کی وجہ سے آپ ﷺ کے قول میں ایک خاص ادبی حسن پیدا ہو گیا ہے۔

ایک ادبی تحسین وتزئین کا نمونہ: ''اِنّ مِنَ الْمَعْرُوفِ اَنْ تَلْقٰی اَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ / یہ بھی نیکی ہے کہ تم اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملو۔ اس میں جس صوتی آہنگ کو برتا گیا ہے وہ اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہیں۔ جو خوبصورت اور پاکیزہ تعلیم اس میں دی گئی ہے اس کا تو کہنا ہی کیا''[۶]۔

اس بحث کے آخر میں مولف نے کلامِ نبوی ﷺ کے صوتی حسن اور ادبی جوہر کی ایک اور مثال دعاء کے ان کلمات کو نقل کر کے پیش کی ہے: ''اَللّٰھمّ مُنْزِلَ الْکِتَابِ وَمُجْرِیَ السحابِ وَھَازِمَ الاَحْزَابِ اھْزِمْھُمْ وَ انْصُرْنَا عَلَیْھِمْ / اے اللہ! کتاب کو نازل کرنے والے، بادلوں کے چلانے والے، اور جتھوں کو شکست دینے والے! ان (دشمنانِ حق) کو ہزیمت دے اور ان کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما''[۷]۔

ہر حدیث کی اردو ترجمانی وتشریح سے قبل مولف نے اس کا عربی متن نقل کرنے کا اہتمام کیا ہے اور منقولہ حدیث کے ماخذ کی نشان دہی بھی کی ہے، لیکن صرف متعلقہ ماخذ یا اس کے مرتب کے نام کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے، یعنی زیرِ بحث حدیث متعلقہ ماخذ میں کس کتاب اور کس باب کے تحت مندرج ہے، اسے ذکر نہیں کیا ہے۔ ''کلام نبوت'' کے حواشی یا تشریحی نوٹس میں مختلف مقامات پر قدیم وجدید ماہرینِ علمِ قرآن وحدیث کا حوالہ ملتا ہے، مثلاً قدیم ماہرینِ علمِ قرآن وحدیث میں ابن الجوزیؒ (م:۱۲۰۱ء)، امام النوویؒ (م:۱۲۷۷ء)، ابن تیمیہؒ (م:۱۳۲۸ء)، ابن قیمؒ (م:۱۳۵۰ء)، ابن حجر عسقلانی (م:۱۴۹۴ء)، احمد ابن محمد القسطلانی (م:۱۵۱۷ء)، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م:۱۷۶۲ء) اور جدید دور کے ممتاز علماء میں مولانا حمید الدین فراہیؒ (م:۱۹۳۰ء)۔

۵۔ یہاں نَفْس (حرف فاء پر سکون) لکھا گیا ہے جب کہ ترمذی (کتاب الفتن حدیث نمبر:۲۲۱۳) میں نَفَس (فاء پر فتحہ) لکھا ہوا ہے۔ اس حدیث کو ''ضعیف'' اور ''غریب'' بتایا گیا ہے۔ لیکن جو معنٰی فاضل مصنف نے نقل کیا ہے وہ نفَس کا ہے یعنی اللہ پاک نے محمدؐ کو ایسے وقت میں نبی بنا کر بھیجا جب قیامت کا وقت قریب آ چکا تھا، یعنی اس کی شرطیں اور علامتیں ظاہر ہونے لگی تھیں (ابن منظور، لسان العرب، دار صادر، بیروت، ب،ت۔ ۲۳۳/۶۔۲۳۷) (مدیر)

۶۔ کلامِ نبوت، ۳۴/۱۔۳۵

۷۔ ماخذ سابق، ۳۶/۱

زیرِ تعارف کتاب کے مشتملات کے سب سے قیمتی و مفید اجزاء احادیث کی تشریحات کی صورت میں اس کے حواشی ہیں، تقریباً ہر حدیث کے ترجمہ میں ایک دو حاشیے لازمی طور پر ملتے ہیں۔ بہت سے مقامات پر حواشی نصف یا نصف سے زائد صفحے میں پھیلے ہوئے ہیں، بعض مقامات پر دو صفحے کے برابر ہیں۔ شرح وبسط سے بھر پور اِن حواشی کی خصوصیات میں سادہ زبان، آسان اسلوب اور دل نشیں اندازِ بیان خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ''کلامِ نبوت'' کے حواشی میں حدیث کی تشریح کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ بہت سے مقامات پر زیرِ تشریح حدیث کے مضمون کی اہمیت و معنویت قاری کے دل میں جاگزیں کرنے کی خاطر اس کے ہم معنی قرآنی آیات بھی نقل کی گئی ہیں، جس سے حدیث کا مفہوم اور اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور مشہور حدیث ''الطھور شطر الایمان'' (طہارت یا پاکی نصف ایمان ہے) کی تشریح کرتے ہوئے سورۃ البقرۃ کی آیت/۲۲۲ اور سورۃ التوبۃ کی آیت/۱۰۸ نقل کی ہیں: اِنَّ اللّٰـہ یُحِبُ التَوّابِیۡنَ وَیُحِبُّ الۡمُتَطَھّرِیۡنَ اللہ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ وَ اللہُ یُحِبُّ الۡمُطّھِّرِیۡنَ اور اللہ پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے[۸]۔ اسی طرح قیامِ لیل یا نمازِ تہجد کی فضیلت سے متعلق حدیث ''علیکم بقیام اللیل فانّہ دأ اب الصالحین و ھو قربۃ لکم الیٰ ربّکم و مکفرۃ للسیئات'' (رات میں نماز پڑھنا تم سے مطلوب ہے، یہ نیک لوگوں کا شیوہ، قربتِ الٰہی کا وسیلہ اور گناہوں کے اثرات زائل کرنے کا ذریعہ ہے) کی تشریح کرتے ہوئے سورۃ المزّمل کی آیت ۶ اور سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۷۹ کا حوالہ دیا گیا ہے: وَمِنَ الّیلِ فَتَھَجّد بِہٖ نَافِلَۃً لکَ عَسَیٰٓ اَن یَبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَاماً مَحۡمُوۡدَاً (اور رات میں تہجد کی نماز پڑھ کہ یہ تیرے لیے نفل ہے، بعید نہیں کہ [اس کے توسط سے] تیرا رب تجھے مقامِ محمود پر فائز کردے)[۹]۔ مزید یہ کہ زکوٰۃ و صدقات کی اہمیت و فضیلت اور غرباء و مساکین کی مالی اعانت کی ترغیب دینے والی احادیث کی تشریح کے ضمن میں سورۃ التوبۃ کی آیت نمبر ۱۰۴ اور سورۃ المعارج کی آیت ۲۴۔۲۵ وَالّذِیۡنَ فِیۡ اَمۡوَالِھِمۡ حقٌّ مَّعۡلُوۡ مٌ لِلسَّا ئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ اور جن کے مالوں میں مانگنے والوں اور محرومین کا حق مقرر ہے) نقل کی گئی ہے[۱۰]۔

احادیث کی تشریح میں قرآنی آیات کے حوالے کی یہ چند مثالیں پیش کی گئی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ہر جلد

۸۔ کلامِ نبوت، ۱/۳۷۵۔۳۷۶، حاشیہ نمبر۔۱

۹۔ کلامِ نبوت، ۱/۴۰۰، حاشیہ نمبر۔۵

۱۰۔ کلامِ نبوت، ۱/۴۰۹، حاشیہ نمبر۔۱؛ ۱/۴۱۳، حاشیہ نمبر۔۱

میں اس کی سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔ گویا ''کلامِ نبوت'' میں احادیث کی تشریح کے ضمن میں آیات کے حوالے قاری کو قرآنی افکار و تعلیمات سے بھی روشناس کرتے ہیں۔ اس کتاب کی اسی انفرادیت کو اجاگر کرتے ہوئے سکریٹری ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی مولانا اشہد جمال ندوی تحریر کرتے ہیں :

''کلامِ نبوت کا موضوع خلاصۂ حدیثِ پاک ہے۔ فرمودات رسالت مآب کی نہایت دل نشیں تشریح۔ اس کی بین السطور کا دیگر مجموعہ ہائے احادیث سے موازنہ کیا جائے تو مولانا محترم کی یہ عظیم کاوش بھی حدیث کی کتاب کے بجائے قرآن مجید کی تفسیر معلوم ہوگی''[11]۔ زیرِ تعارف مجموعۂ تشریحاتِ حدیثِ نبوی ﷺ کی مذکورہ منفرد خصوصیت کے حوالے سے یہ تاثر مبالغہ نہیں، بلکہ مبنی بر حقیقت ہے۔ واقعہ یہ کہ مولانا مرحوم کی ہر تقریر و ہر تحریر حافظ شیرازی کے اس شعر کی ترجمان ہوتی تھی: آنچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآن کردم۔ مزید براں کتاب میں متعدد مقامات پر زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق قرآن و حدیث کی تعلیمات کی تائید میں قدیم کتب سماوی (بالخصوص توریت، انجیل، زبور) سے اقتباسات بھی نقل کیے گئے ہیں[12]۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیرِ مطالعہ کتاب میں حواشی کے تحت احادیث کی تشریحات جاذبیت سے بھرپور اور دل و دماغ میں اتر جانے والی ہوتی ہیں، انہیں پڑھتے جایئے اور زبان و بیان کی خوبیوں اور ادبی لطافتوں کے ساتھ معارف و حکم کے خزانے سے اپنے دامن بھرتے جایئے۔ اپنے اس تاثر کی تائید میں حواشی سے کچھ مثالیں دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ایک حدیث کی تشریح میں جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''وہ شخص کامیاب ہوگیا جس کے دل کو اللہ نے ایمان کے لیے خالص کرلیا اور اسے قلبِ سلیم، سچ بولنے والی زبان اور نفس مطمئنہ سے نوازا''، مولفِ حاشیہ میں رقم طراز ہیں:

جس شخص کا دل سچائی کا ادراک کرلیتا ہے، پھر نہ اسے فراموش کرتا ہے اور نہ کبھی اسے نظرانداز کرتا ہے اس شخص کے کامیاب ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ دل میں اگر حق اتر چکا ہے اور دل نے اسے

۱۱۔ آہ! مولانا محمد فاروق خاں رحمہ اللہ، سہ ماہی دعوت القرآن، ۳/۱۳، جولائی۔ ستمبر ۲۰۲۳ء، ص ۲۱۳

۱۲۔ کلام نبوت، ۱/۱۴۶، حاشیہ نمبر۔۵؛ ۱/۱۴۷، حاشیہ نمبر ۔ ۵؛ ۱/۱۷۵، حاشیہ نمبر۔۱؛ ۱/ ۱۹۷، حاشیہ نمبر۔۱۴؛ ۱/۲۲۳، حاشیہ نمبر۔۱؛ ۱/۴۰۸، حاشیہ نمبر۔۱؛ ۱/۵۳۸، حاشیہ نمبر۔۱۴؛ ۱/۵۳۹، حاشیہ نمبر۔۱۵؛ ۱/۵۵۹، حاشیہ۔۲

پوری طرح محفوظ کرلیا ہے تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ انسان اپنی زندگی میں راہِ راست سے کبھی گریز نہیں کرسکتا۔ اس کی پوری زندگی سچائی، حق پرستی کی آئینہ دار ہوگی۔ اس طرح سے دل کی درستی انسان کی کامیابی کی اصل ضامن ہے۔ خدا کے رسول ﷺ نے سچ فرمایا: ''وہ شخص کامیاب ہوگیا جس کا دل محفوظ رکھنے والا بنا ہے''۔ قرآن میں اسی بات کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا: یَوْ مَ لا یَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُوْنٌ اِلَّا مَنْ اَتَی اللہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (الشعراء: ۸۸-۸۹) (جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد بجز اس کے کہ کوئی صحیح سالم دل لے کر خدا کے پاس آیا ہو) [۱۳]۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی یہ حدیث بہت معروف ہے: انّ رسول اللہَ ﷺ نام علَی حصیرٍ فقامَ وَقد اَثّر فی جسدہٖ فَقَالَ ابن مَسْعُودُ یَا رسول اللہ لَوْ امَرْتَنَا اَنْ نبسُطَ لَکَ و نَعْمَلَ فَقالَ: مَا لیَ وَللدُّنیَا وَمَا اَنَا فِی الدُّنیَا اِلّا کَرَاکِبٍ اِسْتَظَلّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمّ رَاحَ وَ تَرَکَھَا [۱۴]۔ [رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ ایک چٹائی پر سوئے، جب اٹھے تو آپ ﷺ کے جسم پر اس (چٹائی) کے نشانات پڑے ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کاش آپ ﷺ ہمیں حکم دیتے تو ہم آپ ﷺ کے لیے بستر بچھا دیتے، آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے دنیا سے کیا غرض؟ میرا اور دنیا کا تعلق تو بس ایسا ہے، جیسے کوئی سوار (مسافر) کسی درخت کے نیچے سایہ لینے کو ٹھہرے اور پھر اسے چھوڑ کر (اپنی منزل کی طرف) چل دے]۔ اس حدیث کی تشریح میں مولانا مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ جب دنیا ہماری اصل منزل و مقام نہیں ہے تو پھر یہاں کی راحت اور آرام کے لیے ہم زیادہ فکرمند کیوں ہوں۔ کیا وہ سوار جو سایہ لینے کے لیے کسی درخت کے نیچے تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرتا ہے، درخت کے نیچے آرام گاہ تعمیر کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے یا اسے آگے منزل کی طرف بڑھنے کی فکر ہوتی ہے۔ اس لیے عقل مندی کی بات تو یہ ہے کہ آدمی دنیا کی راحتوں اور آسائشوں کو فراہم کرنے کی فکر میں اپنے اوقات کو صرف کرنے کے بجائے اپنے اوقات اور اپنی قوتوں کو آخرت کی تعمیر میں صرف کرے [۱۵]۔

۱۳۔ کلامِ نبوت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ۲/۳۲۳-۳۲۴، حاشیہ نمبر۔۳

۱۴۔ سنن ترمذی، ابواب الزہد، باب حدیث ''مَا اَنَا فی الدُّنیَا اِلّا کَرَاکِبٍ اِسْتَظَلّ''۔

۱۵۔ کلامِ نبوت، ۱/۳۱۹-۳۲۰، حاشیہ نمبر۔۳۵

اس حدیث کو پڑھ کر کسی کو یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ یہ تو گوشہ نشینی یا سب کچھ چھوڑ کر رہبانیت کی تعلیم دیتی ہے، مولانا مرحوم نے اسی کے ہم معنیٰ ایک دوسری حدیث کی تشریح کرتے ہوئے اس غلط فہمی کو اس طور پر رفع فرمایا: ''اس نصیحت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی گوشہ گیری اختیار کر لے اور دنیا اور اہلِ دنیا کو چھوڑ دے کہ وہ جس طرح چاہیں اس میں فتنہ وفساد برپا کریں اور ظلم وجور کو روا رکھیں۔ آدمی کو رزقِ حلال کی فکر کرنی ہوگی، اہل وعیال کی تعلیم وتربیت کی طرف بھی توجہ دینی ہوگی۔ دنیا سے برائی مٹے اور دینِ حق کو فروغ حاصل ہو، اس کے لیے بھی اسے سوچنا ہوگا۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ وہ یہاں ایک مسافر ہے جسے یہاں سے جلد ہی کوچ کرنا ہے، بلکہ وہ تو اپنے آپ کو ان لوگوں میں شمار کرے گا جو یہاں سے جا چکے اور قبروں نے جنہیں اپنے اندر چھپا لیا''[۱۶]۔

حضرت عائشہؓ سے مروی اس حدیث: یَاعَائشَةُ اِیَّاكَ وَمُحقَرَاتِ الذُّنُوبِ فَاِنَّ لَهَا مِنَ اللهِ طَالِباً [اے عائشہ! اُن گناہوں سے بچتی رہنا جن کو حقیر ومعمولی سمجھا جاتا ہے، اس لیے کہ اللہ کی طرف سے ان کی بھی باز پرس ہوگی] کی تشریح میں مولف گرامی رقم طراز ہیں:

> اس سے معلوم ہوا کہ صغیرہ گناہوں سے بھی بچنا ضروری ہے۔ معمولی گناہ بھی اگر کوئی کرتا ہے تو اس سے دل زنگ آلود ہو جاتا ہے، بلکہ صغیرہ گناہ پر اصرار سے کبیرہ بن جاتا ہے۔ کسی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر انسان کا اس پر دلیر ہونا صحیح نہیں ہے، اس سلسلہ میں حافظ ابن قیمؒ نے کتنی اچھی بات کہی ہے کہ ''گناہ کو یہ نہ دیکھو کہ وہ کتنا معمولی اور چھوٹا ہے، بلکہ اس خدا کی عظمت اور بڑائی کو پیشِ نظر رکھو جس کی نافرمانی کی جسارت کی جارہی ہے''۔ خدا کی عظمت کا احساس اگر ہو تو صغیرہ گناہ بھی سنگین محسوس ہوگا۔[۱۷]

ام المومنین حضرت امِّ سلمہؓ سے مروی یہ حدیث مشہور ہے کہ روزانہ بعد نمازِ فجر یہ دعاء مانگنا نبی کریم ﷺ کا معمول تھا: اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسئَلُكَ عِلماً نَافِعاً وَّرِزقاً طَیِّباً وَّعَمَلاً مُتَقَبَّلاً [اے اللہ! میں تجھ سے علم نافع، عملِ مقبول اور پاک روزی کی درخواست کرتا ہوں]۔

حاشیہ میں ''علمِ نافع'' کی دل نشیں تشریح مولانا مرحوم کے اِن الفاظ میں ملاحظہ کریں: ''علمِ نافع

۱۶۔ کلام ِنبوت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء، ۱۵۴/۵

۱۷۔ ماخذ سابق، ۳۲۴/۲، حاشیہ نمبر۔۴

حاشیہ میں ''علمِ نافع'' کی دل نشیں تشریح مولانا مرحوم کے اِن الفاظ میں ملاحظہ کریں: ''علمِ نافع سے مراد وہ علم ہے جو کار آمد ہو، بے کار و بے مقصد نہ ہو۔ وہی علم علمِ نافع ہے جس سے ایمان کو قوت حاصل ہو، جس سے دین کے فہم میں اضافہ ہو، جس سے راہِ حق پر چلنا آسان ہو سکے، جس کے ذریعہ سے اپنے دین کی حفاظت ممکن ہو، جو عزتِ نفس کی محافظت کا سبب ہو، جس کے ذریعہ سے دینِ حق کی خدمت انجام پا سکے اور جس کے ذریعہ سے بندگانِ خدا کی خدمت کا کام بھی انجام دیا جا سکے''[18]۔

حواشی کے تحت مختصر انداز اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں فاضل شارحِ حدیث کس طرح ایمان وعمل سے متعلق قیمتی پیغام دیتے تھے۔

اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو: اِس حدیث (اذَا جاء ہ' اَمْرٌ سُرُورٌ اَوْ بُشِّرَ بِہٖ خَرَّ سَاجِدًا شَاکِرًا / نبی کریم ﷺ کے پاس جب کوئی خوشی کی بات پہنچتی یا آپ ﷺ کو اس کی خوش خبری دی جاتی تو آپ ﷺ شکر ادا کرنے کے لیے سجدے میں گر پڑتے) کی تشریح میں وہ تحریر کرتے ہیں:

> جذبۂ شکر ہی ایمان کی اساس ہے۔ ہمارے دلوں کو بہترین احساسات اور حسین تر آرزوؤں سے زندہ رکھنے والا ہمارا خدا ہی ہے۔ وہی ہماری تمناؤں کی تکمیل کا سامان بھی کرتا ہے۔ اس لئے ہر مسرت اور خوشی کے موقع پر اس کا شکر ادا کر کے ہمیں اپنے باہوش اور باشعور ہونے کا ثبوت دیتے رہنا چاہیے[19]۔

''کلامِ نبوت'' کی تشریحات اس لحاظ سے بھی افادیت سے بھرپور ہیں کہ بہت سی احادیث کی تشریح کے ضمن میں اسی کے ہم معنیٰ کوئی دوسری روایت (بعض مقامات پر ایک سے زائد روایات) نقل کر کے مولفِ گرامی نے زیرِ تشریح حدیث کے مفہوم کو مزید واضح فرما دیا ہے۔ اور کہیں زیرِ تشریح حدیث سے ایک ذیلی نکتہ یا مسئلہ اخذ کر کے اپنے تشریح نوٹ کی افادیت کو اور بڑھا دیا ہے۔ ''استیذان'' (کسی کے گھر پہنچنے پر داخلہ کی اجازت طلبی) سے متعلق سنن ابوداؤد میں مذکور یہ حدیث بہت معروف ہے کہ جب کسی کے دروازے پر کوئی اس غرض سے پہنچے تو دروازے سے ہٹ کر کھڑا ہو، تاکہ اس کی نگاہ کسی پر نہ پڑے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا محترم نے پہلے یہ سنتِ نبوی ﷺ بیان فرمائی کہ ''خود نبی ﷺ جب کسی کے یہاں تشریف لے جاتے تو دروازے کے دائیں یا بائیں

۱۸۔ کلام نبوت، ۲/۸۳، حاشیہ نمبر۔ ۱۸

۱۹۔ کلام نبوت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ۳/۲۶۱۔۲۶۲، حاشیہ نمبر۔ ۵

کھڑے ہوتے، دروازے کے ٹھیک سامنے ہرگز کھڑے نہ ہوتے''[20]۔ اور پھر حدیث کی تشریح کے آخر میں یہ مفید اضافہ بھی کیا ہے کہ بغیر اجازت کسی کے خط پر نظر ڈالنا بھی سخت گناہ کی بات ہے۔ چنانچہ حضورﷺ کا ارشاد ہے: ''مَنْ نَظَرَ فِی کِتَابِ اَخِیهِ بِغَیْرِ اِذْنِهٖ فَاِنَّمَا یَنْظُرُ فِی النَّارِ'' (سنن ابوداؤد) [جس کسی نے اپنے بھائی کے خط میں اس کی اجازت کے بغیر نظر دوڑائی وہ بس آگ میں جھانکتا ہے''[21]۔ موجودہ دور میں بہت سے لوگوں کی اس عادت (کسی کے خط کو بے محابا پڑھ لینے) کے سیاق میں یہ تشریح اہمیت و معنویت سے خالی نہیں ہے۔

''کلامِ نبوت'' میں حواشی کے تحت تشریحات کا ایک اور مفید پہلو یہ ہے کہ زیرِ تشریح حدیث سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہوتا ہے تو شارحِ محترم نے اسے (مع ذکر آراء معروف فقہاء) واضح کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ متعلقہ حدیث سے فقہی مسئلہ اخذ کرنے میں اگر فقہاء میں اختلاف پایا جاتا ہے تو انہوں نے اس کی وضاحت بھی کر دی ہے اور اہم مسائل میں فقہی مسالک کے ائمہ کا موقف نقل کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس طرح کی فقہی تشریحات کتاب کی جلد سوم و چہارم میں زیادہ پائی جاتی ہیں جن میں معاشرت و معیشت کے مسائل پر احادیث کو جمع کر کے ان کی ترجمانی و تشریح پیش کی گئی ہے۔

مولانا محمد فاروق خاں مرحوم، جیسا کہ معروف ہے، شعر و ادب کا بہت عمدہ و پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، اور ''فراز'' تخلص اختیار کرتے تھے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے (''حرف و صدا''، طبع اول ۱۹۹۱ء اور ''لمعات''۔ کلیاتِ مولانا محمد فاروق خاں فراز سلطان پوری، طبع ۲۰۲۱ء) منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے ادبی ذوق اور شعر و شاعری میں گہری دلچسپی کی جھلکیاں ''کلامِ نبوت'' میں بھی مختلف مقامات پر ملتی ہیں۔ شعر سے متعلق مشہور حدیث ''اِنّ مِنَ الشِّعْرِ حِکْمَةً '' کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مرحوم نے شعر کا مفہوم، اس کا اصل جوہر، اور اچھے شاعر کا امتیازی وصف جس ماہرانہ انداز و دلکش اسلوب میں واضح کیا ہے وہ خود ان کے صاف ستھرے و پاکیزہ ادبی ذوق اور شعر و شاعری کے بلند تصور کا عکاس ہے:

> شعر کے معنیٰ جاننے یا زیرکی اور دانائی کے بیان کیے گئے ہیں، لیکن اصطلاح میں شاعری درحقیقت نفیس و بیش قیمت تجربات کا مکمل و موزوں، حسین بیان و اظہار ہے۔ شاعر اپنے تجربات و احساسات کی

۲۰۔ کلام نبوت، ۳/ ۱۲۹۔ ۱۳۰، حاشیہ نمبر ۴

۲۱۔ ماخذ سابق، ۳/ ۱۳۰، حاشیہ نمبر ۴

ترجمانی کے لیے الفاظ ونقوش اور وزن وآہنگ کا استعمال کرتا ہے۔شاعر میں اگر صناعی کی کمی نہیں ہے تو لازماً وہ اپنے احساسات کو حسین تر اور موزوں تر الفاظ کی شکل میں ظاہر کرے گا۔ پھر شاعری کا جزءِ اعظم تخئیل ہے،شاعری تاثرات کے اظہار میں تخئیل خاص طور سے استعمال کرتی ہے۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ شاعری کی دنیا خواب دیکھنے کی کیفیت سے بہت زیادہ تعلق رکھتی ہے۔شاعری اصلاً ہماری روح سے سروکار رکھتی ہے۔شاعری کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ فرد بشر جن اقدار کا مرکز اور حامل ہے وہ ان کو بے نقاب کرسکے۔شاعری میں جن چیزوں کا اظہار ہوتا ہے ان کے پہلو بہ پہلو ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جو ماورائے اظہار ہوتی ہیں،اور وہی شاعری کا اصل جوہر ہوا کرتی ہیں۔اس کے علاوہ شعر کے شعر ہونے کے لیے اس میں اصلیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔اصلیت کے بغیر صرف حسین وموزوں الفاظ جمع کردینے سے شاعری ممکن نہیں ہوتی۔شاعری صرف حسین وموزوں الفاظ جمع کردینے کا ہرگز نام نہیں ہے۔اچھی شاعری کے لیے ضروری ہے کہ شاعر جن احساسات وتجربات کا اظہار اپنی شاعری میں کررہا ہے ان کو اس نے پوری طرح محسوس کیا ہو،جن جذبات واحساسات کا اظہار شعر میں کیا جائے وہ شاعر کے اپنے حقیقی جذبات واحساسات بن چکے ہوں[۲۲]۔

اب مذکورہ حدیث کی جامع تشریح بھی ملاحظہ فرمائیں:

اس حدیث میں حضور ﷺ نے شعر کے بارے میں اس کے فکر کے پہلو سے اظہارِ خیال فرمایا ہے۔آپ ﷺ کے نزدیک وہ بہترین شعر ہے جس میں بصیرت، دانائی،شرافت اور پاکیزگی کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہو[۲۳]۔

مولفِ محترم کے شعر وادب سے گہرے تعلق کا اثر ہے کہ زیرِ تعارف کتاب میں ادبی چاشنی،طرزِ ادا کی شگفتگی اور اسلوبِ بیان کی دلکشی بھی پائی جاتی ہے اور بعض مقامات پر برمحل اشعار کے حوالوں نے اس کی ادبی چاشنی کو اور بڑھا دیا ہے۔جلد پنجم کے باب اول کی ابتداء میں ''دین جس کی دعوت دینی ہے'' کے عنوان سے ایک تحریر میں دین برحق کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے مولفِ محترم تحریر فرماتے ہیں:

۲۲۔ کلام نبوت،۳/ ۳۴۲۔۳۴۳،حاشیہ نمبر۔۱

۲۳۔ ماخذ سابق،۳/ ۳۴۳،حاشیہ نمبر۔۱

دین نام ہے لطافتِ احساس کا۔خدا کی حمد اور اس کی محبت دین کی اساس ہے۔خدا کی تحمید ہی ہماری زندگی ہے۔یہ حمد وثنا کی محبت سے لبریز ہوتی ہیں۔اس حمد وثنا سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بندہ خدا کا انتہائی شکرگزار ہے۔خدا کی اس پر جو عنایات کی بارش ہے اس کا اسے پورا احساس ہے۔اس نے ذرّہ کو آفتاب کے درجہ تک پہنچا دیا اور اسے وہ کچھ عطا کیا جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا.... یہی وہ چیز ہے جو مومن کی زندگیوں میں ایمان کی قوت بن کر کارفرما ہوتی ہے۔ اور آدمی کو شک وریب اور بے یقینی کی زندگی سے نجات دلاتی ہے۔اور بندہ زندگی ہی نہیں موت کے راز سے بھی واقف ہوجاتا ہے۔وہ جان جاتا ہے کہ موت زندگی کے خاتمہ کا نام ہرگز نہیں، بلکہ موت سے دوامِ حیات کی ابتدا ہوتی ہے

ع ہے یہ شامِ زندگی، صبح دوامِ زندگی[۲۴]۔

یہ مصرعہ جب پہلی بار'' کلامِ نبوت'' میں ناچیز کی نظر سے گزرا تو بہت پسند آیا، لیکن اس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ کس کا شعر ہے، دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ یہ علامہ اقبال کا ہے۔کلیاتِ اقبال میں تلاش کرنے پر اس کا پہلا مصرعہ ''موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی'' سامنے آیا[۲۵]، تو شعر کی معنویت پوری طرح آشکارا ہوگئی۔

اُس حدیث کو نقل کرنے کے بعد اس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مرحوم نے پہلے یہ تحریر فرمایا:'' اخلاص کی اصل روح محبت ہی ہے۔محبت ہی ہے جو آدمی کو کسی کے لیے ہر پہلو سے یکسو کردیتی ہے''، پھر یہ مصرعہ نقل کیا:''عجب چیز ہے لذتِ آشنائی''[۲۶]۔مزید یہ کہ ایک دوسری مشہور حدیث کی تشریح میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اہلِ ایمان ایک دوسرے سے محبت، یگانگت اور اپنائیت کے مظاہرے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہنے میں ایک جسم کے مانند ہیں جس کا ایک حصہ کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے تمام اعضاء اس کی کسک محسوس کرتے ہیں اور بے چین ہوجاتے ہیں، مولفِ گرامی نے شیخ سعدیؒ کے برمحل اشعار نقل کیے ہیں:

۲۴۔ کلامِ نبوت، ۵/۱۴

۲۵۔ کلیات اقبال، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۲۰۷

۲۶۔ کلامِ نبوت، ۲/۶۹، حاشیہ نمبر ۱۴

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند که در آفرینش ز یک گوہر ند
چوں عضوے بدرد آورد روز گار دیگر عضوہا را نماند قرار [۲۷]

''کلامِ نبوت'' کا ایک اور قابلِ ذکر پہلو ضرورت کے مطابق مختلف مقامات پر انگریزی الفاظ کا استعمال ہے۔ کتاب کے حواشی (اور کہیں کہیں بعض ابواب کے مقدمہ کے متن میں بھی) میں عام مغربی مفکرین، مصنّفین اور مستشرقین کے افکار یا ان کی کتابوں کے ذکر میں ان کے ناموں کو انگریزی میں مندرج کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے اور بہت سے مقامات پر مولفِ محترم نے ان کے ناموں کو انگریزی میں لکھنے کے ساتھ اردو میں بھی تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ قارئین کی آسانی کے لیے اردو کے مشکل الفاظ اور اصطلاحات کا انگریزی متبادل بین القوسین دیا گیا ہے۔ انگریزی الفاظ کے ان اضافوں کی وجہ سے کتاب کی افادیت مزید بڑھ گئی ہے۔

آخر میں بزرگ شاعر جناب ابوالمجاہد زاہد مرحوم (م ۲۸/جون ۱۹۲۸ء - ۶/مارچ ۲۰۰۹ء) کا یہ شعر (جو ناچیز کے خیال میں مولانا محمد فاروق خاںؒ کی شخصیت پر صادق آتا ہے) نقل کرنا اہمیت سے خالی نہ ہوگا:

لوگ چن لیں جس کی تحریریں حوالوں کے لیے زندگی کی وہ کتابِ معتبر ہو جایئے [۲۸]

مختصر یہ کہ قرآن و حدیث کے خادم، ممتاز دانشور، معروف مصنف و دل کش اندازِ بیان سے متصف مولانا محمد فاروق خاںؒ کی تالیف ''کلام نبوت'' اپنی خصوصیات کی وجہ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق احادیثِ نبوی ﷺ کے انتخاب کا یہ ایک عمدہ نمونہ، دل نشیں تشریحات سے مزین، قرآنی آیات کے حوالوں سے مستحکم، قدیم و جدید علمائے قرآن و حدیث کے افادات سے آراستہ اور زبان و بیان کی خوبیوں سے معمور ہے۔

☆☆☆

۲۷۔ کلامِ نبوت، ۳/۲۱۹-۲۲۰، حاشیہ نمبر-۱

۲۸۔ کلّیاتِ زاہد، مرتبہ ڈاکٹر تابش مہدی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۶۱

رام نرائن حاجی پوری: فارسی کا ایک گمنام مصنف

ڈاکٹر محمد ذاکر حسین ندوی
خدا بخش لائبریری، پٹنہ
zakirkbl@gmail.com

شاہنامہ کے قلمی نسخوں کے مطالعہ کے دوران اس کی ایک نثری تلخیص پر نظر پڑی۔ ورق گردانی سے پتا چلا کہ اسے صوبہ بہار کے حاجی پور کے رہنے والے رام نرائن نے مرتب کیا ہے۔ علمی دنیا کے لئے یہ ایک نئی دریافت ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اس کے بارے میں علمی دنیا کو واقف کراؤں۔ اس سلسلے میں، میں نے مختلف تذکروں کا مطالعہ کیا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مجھے زیر تذکرہ مصنف کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں مل سکی۔ جب معلومات کے سارے ذرائع ناکام ہو گئے تو میں نے اصل مخطوطہ کو ہی اپنا ماخذ بنایا۔ مسرت کا مقام ہے کہ مخطوطہ نے پورا پورا ساتھ دیا۔ در اصل مصنف نے اس کتاب کے مقدمہ میں سبب تالیف کے علاوہ اپنے بارے میں بھی لکھا ہے۔ اسی کو بنیاد بنا کر میں مصنف کے احوال کو ترتیب دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔

وطن وقوم: رام نرائن حاجی پور (صدر دفتر موجودہ ضلع ویشالی) کے باشندہ تھے[1]۔ انہوں نے اپنے وطن کا ذکر بہت ہی والہانہ انداز میں کیا ہے۔ حاجی پور کو انہوں نے دار السرور اور شہر فردوس مظہر جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے[2]۔ یہاں کے مردوں کو رضوان (جنت)، عورتوں کو حور، اس کی مٹی کو کافور اور اس کی ہریالی کو سمور[3] عشرت پیرا جیسے اوصاف سے متصف کیا ہے[4]۔ ان کا تعلق اسی قوم کائستھ سری واستو سے

۱۔ زاد بوم من از مضافات صوبہ ہمیشہ بہار بہار قصبہ دار السرور حاجی پور است (تلخیص شاہنامہ مخزونہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ، HL 367/ cat.11 ق۲الف)

۲۔ قصبہ دار السرور حاجی پور (ق۲الف)، شہر فردوس مظہر حاجی پور (ق۳الف)

۳۔ ایک برفستانی جانور جس کا رواں گرم اور ملائم ہوتا ہے۔

۴۔ کہ مردش رضوان است وزنش حور وخاکش کافور است وسبزہ اش سمور عشرت پیرا بودہ (۱۳الف)

ہے، جس کے یہاں تعلیم کا رواج اعلیٰ پیمانہ پر تھا[۵]۔

سال ولادت: رام نرائن نے اپنی تاریخ ولادت کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے البتہ دو مقامات پر انہوں نے ایک ایسا اشارہ دیا ہے، جس کی روشنی میں ان کی تاریخ پیدائش متعین کی جا سکتی ہے۔ مقدمہ میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ ابتدا سے عشرۂ پنجم کے قریب الاختتام مرحلہ تک وہ کسی بھی قرض خواہ سے شرمندہ نہ ہوئے[۶]۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ اس دن سے آج جب کہ میری عمر ۴۷ برس ہے[۷]۔ گویا اس کتاب کی تالیف کے وقت رام نرائن کی عمر ۴۷ برس تھی۔ اب یہ تحقیق ضروری ہے کہ یہ کتاب کب لکھی گئی تو اس بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے کہ محمد شاہ بادشاہ (جس کا اقبال اردشیر بابکان کے اقبال سے بلند ہو اور جس کی قسمت یوسف مصری کے نصیب کے برابر ہو) کے عہد میں ۱۱۴۰ھ میں اس کتاب کو مکمل کیا[۸]۔ یعنی ۱۱۴۰ھ/۱۷۲۷ء میں رام نرائن ۴۷ برس کے تھے۔ اس لحاظ سے یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ان کی پیدائش ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۰ء میں ہوئی۔

والد: رام نرائن کے والد کا نام چھچھی نرائن تھا[۹]۔ اپنے والد کے بارے اطلاع دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ان کے والد عالی قدر اورنگ زیب کے عہد میں شہزادہ محمد بیدار بخت بہادر کے دیوان میں سہ صدی منصب اور پیشکاری کے عہدے پر فائز تھے۔ منشیوں میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ دکن سے انہوں نے اپنے بیٹے رام نرائن کو لکھا کہ اگر منشی گیری میں مہارت حاصل کرنی ہو تو روضۃ الصفا کا مطالعہ ضروری ہے[۱۰]۔

۵۔ وقوم من برافواہ والسنہ اہل روزگار بہ کائستھ سری باستب کہرہ مشہور (ق ۲ الف)

۶۔ از بدو صبح ایجاد تا نزدیک انقطاع مراحل عشرہ پنجم گل برگ خاطر مرا بہ خار تقاضای قرض خواہان نخراشیدہ گواہ است (ق ۲ الف)

۷۔ کہ از آن روز تا امروز کہ سال چہل و ہفتم است (ق ۴ ب)

۸۔ وچون در اوایل سنہ یک ہزار و یک صد و چہل ہجری در عہد بادشاہ محمد شاہ کہ اقبالش فزون تر از اقبال اردشیر بابکان است و طالعش طالع یوسف مصری توامان این کتاب خجستہ صورت سرانجام پذیرفتہ منتخب بی بدل تاریخ آن یافتہ (ق ۷ الف)

۹۔ رام نرائن خلف الصدق چھچھی نرائن (ق ۱)

۱۰۔ اما چون پدر عالی قدر من کہ در عہد آن بادشاہ (اورنگ زیب) سہ صدی منصب و خدمت پیشکاری دیوان شاہ زادہ محمد بیدار بخت بہادر داشت و در منشیان روزگار علم امتیازی افراشت از دکہن بمن نوشتہ بود کہ مستعدان کسب انشا را عبور بر روضۃ الصفا ضرور است (ق ۵ الف)

رام نرائن ۳۷/ برس کی عمر تک اپنے والد کے سایہ سے مستفیض ہوتے رہے۔ اسی ۳۷/ ویں سال یعنی ۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۷ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ البتہ ۱۱۴۰ھ/ ۱۷۲۷ء تک ان کے سر پر ان کی والدہ کا سایہ برقرار رہا[۱۱]۔

بھائی: اپنے چھوٹے بھائی دیانت رائے کے بارے میں رام نرائن لکھتے ہیں کہ وہ فرخ سیر کے دربار میں منشی تھے۔ بظاہر وہ منشی تھے لیکن بباطن وہ ایک صوفی منش انسان تھے۔ عمر کے ۳۹/ ویں پڑاؤ پر جب بہار جوانی اپنے انجام کو پہنچتی ہے اور بوڑھاپے کا دور شروع ہوتا ہے، اس وقت انہیں اپنے عزیز بھائی کی موت کا صدمہ سہنا پڑا۔ جس وقت دیانت رائے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، اس وقت رام نرائن کی عمر ۳۹ برس تھی۔ گویا ۱۱۳۲ھ/ ۱۷۱۹ء میں ان کی وفات ہوئی۔ رام نرائن نے یہ مصرعہ تاریخ رقم کیا ہے: آہ زین عالم دیانت رائے مرد[۱۲]۔ اس کے علاوہ کسی اور بھائی بہن کا تذکرہ انہوں نے نہیں کیا ہے۔

شوق مطالعہ: رام نرائن ۲۵/ برس کی عمر (یعنی ۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۵ء) تک اپنے وطن عزیز حاجی پور میں ہی رہے۔ اس دوران وہ ہندستان وایران کے معزز شعرائے کرام اور ادبائے عظام کی کتابوں جیسے مجموع الصنائع، قصہ کامروپ، مہذب الاخلاق، کلیات طالب، ساقی نامہ ظہوری، رباعیات خیام وسحابی نجفی، تذکرۃ الشعراء، تحفۃ الفصحاء، لطائف الظرائف، دیوان ومثنویات مرزا عبدالقادر بیدل، مرزا معز فطرت، ناصر علی، علی رضا تجلی، مرزا طاہر وحید، مرزا ابراہیم ادھم، زلالی، غنیمت، محمد جان قدسی، طاہر غنی کشمیری، محمد زمان راسخ، ابوسعید اعجاز، شوکت اصفہانی، بابا فغانی، مرزا جلال، اسمٰعیل کمال، سعدی شیرازی، نصیر اور نظیر کے مطالعے سے فارغ ہو چکے تھے[۱۳]۔

۲۶ سے ۳۰ برس کی عمر (۱۱۱۹-۱۱۲۳ھ/ ۱۷۰۶-۱۷۱۰ء) تک مرزا ابوالمعالی وزارت خان عالی (م ۱۱۲۸ھ/ ۱۷۱۶ء) کی معیت میں ہندوستان کا سفر کرتے رہے۔ وزارت خان بادشاہ عالم گیر کے زمانے

۱۱۔ تا سی وہفت سال پدر را بر فرق من ظل گستر داشتہ وتا دم این مقال سایہ مادر بر سر من گذاشتہ (ق۲ب)

۱۲۔ ودر سال سی ونہم کہ انجام بہار جوانی وآغاز خزان پیری بود دیانت رائے نام برادر خردی کہ کوی بزرگی از بزرگان روزگار بردی وبظاہر منشی سرکار بادشاہ فرخ سیر بود وبباطن راہ تصوف وتوحید بہ قدم توکل وتجرید می پیمود بہ قضای الٰہی رخت زندگانی از عالم فانی بر بست واین مصرعہ در تاریخ وفات آن برادر حمیدہ صفات بی اختیار از خاطر فاتر برجست مصرع: آہ زین عالم دیانت رائے مرد (ق۴)

۱۳۔ از مجموع الصنائع.....ودیگر شعرائے فحول وفصحائے صاحب قبول ایران وہندوستان انتخاب برداشتم (ق۱۳الف)

میں اکبرآباد اور اجین کے صوبہ دار تھے[۱۴]۔ رام نرائن نے سفر کے ساتھ ساتھ ابواب الجنان، آئین اکبری، اکبرنامہ، اخلاق ناصری، عالم گیرنامہ، کلیات ظہوری، تاریخ ہرات، جامع الحکایات، نگارستان، گوہرستان، شبستان خیال اور مجمع الامثال جیسی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا[۱۵]۔

۳۱ سے ۳۸ سال کی عمر (۱۱۲۴-۱۱۳۱ھ/۱۷۱۱-۱۷۱۸ء) تک وہ سفر میں کم اور پٹنہ میں زیادہ رہے اور منطق الطیر، گلشن راز، مرأت المحققین، زادالمسافرین، نزہت الارواح، سبحۃ الابرار، سلسلۃ الذہب، غرائب الدنیا، لوامع، لوائح، ملفوظات، مکتوبات، حدیقہ، مثنوی، کیمیائے سعادت، انتخاب جعفری اور ہندی کتابوں کے ترجمے جیسے رامائن، مہابھارت، بھاگوت، گیتا، جوگ بشِشٹ جیسی کتابوں کے مطالعے میں غرق رہے۔ اس کے علاوہ بوستان سعدی شیرازی، خمسہ نظامی، جام جم شیخ اوحدی اور تذکرۃ الاولیاء عطار سے بھی مفید معلومات کو اخذ کیا[۱۶]۔

کچھمی نرائن نے دکن سے اپنے لڑکے رام نرائن کو خط لکھا کہ اگر تم منشی گیری میں مہارت حاصل کرنا چاہتے ہو تو روضۃ الصفا کا ضرور مطالعہ کرو۔ والد گرامی کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے وہ اس کتاب کی تلاش میں لگ گئے۔ اتفاقاً ایک روز دھرم نرائن جو عقیدت مند خان کے دربار میں منشی تھا، اس نے مشورہ دیا کہ عقیدت خان کے کتاب خانہ سے یہ کتاب عاریتاً لے کر اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس

۱۴۔ واز بیست و شش سالگی تا سی سال در سفر ہندوستان بہ استلزام رکاب خان سخن دان وزارت خان کہ نام نامی و اسم سامی آن صاحب طبع عالی میرزا ابوالمعالی بود و در شعر عالی تخلص می نمود و در عہد بادشاہ عالم گیر خدمت دیوانی صوبہ مستقر الخلافت اکبرآباد و دارالفتح اجین داشت (ق۳ب)۔ درباره وزارت خان بندرابن داس خوشگو می نویسد: از اہل ایران بود اما در ہند نشو و نما یافتہ۔ در اصل محمد اعظم شاہی است اوائل عہد فرخ سیر بادشاہ شہید بخدمت دیوانی تن سرفرازی داشت۔ صاحب طبع سخنور دوست بود اکثر اوقات صحبت مشاعرہ در خانہ اش منعقد می شد و شاعرنوازیہا می فرمود۔ مشق سخن بہ طرز قدما درست کرده بود.....در ہزار و صد و بست و ہشت در گذشت۔ (سفینۂ خوشگو، بندرابن داس خوشگو، مرتبہ عطا کاکوی، ص۸۳)

۱۵۔ غیر از سیر نسخہ معتبر مثل ابواب الجنان.....ہمت بر شغل دیگر نگماشتم (ق۳ب)

۱۶۔ واز سی و یک سالگی تا سی و ہشت سال کم تر در سفر و بیشتر در شہر بی شر و فتنہ بلدہ پٹنہ اوقات را در مطالعہ کتب و رسالہ تصوف و توحید مانند.....معمور داشتہ واز بوستان.....انتخابی مختصر و مفید بر گرفتہ (۴)

طرح انہوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا۔

شاعری: رام نرائن پوری پابندی سے شعر کہتے تھے یا نہیں، اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ البتہ شعر کہتے تھے، اس کا ثبوت وہ فارسی اشعار ہیں جو ان کی کتاب منتخب شاہنامہ میں درج ہیں۔ چونکہ ان کا کوئی شعری مجموعہ موجود نہیں ہے۔ اس لئے ان کی فارسی شاعری کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ رام نرائن نے اپنے مقدمہ میں زیب بیان کی خاطر اساتذہ شعرائے کرام کے اشعار کو بھی نقل کیا ہے۔ بیشتر مقامات پر انہوں نے شاعر کے نام کے ساتھ شعر کا حوالہ دیا ہے۔ اسی کے ساتھ لمؤلفہ کے عنوان سے اپنا بھی کلام درج کیا ہے۔ لمؤلفہ کے تحت حسب ذیل اشعار نقل کئے گئے ہیں:

رام نراین از بسی آرزو
جامہ این نامہ نمودہ رفو
زانکہ درین دہر بسی روزگار
او نبود این بودش یادگار
خواند ورا ہاتف فرخ پیام
منتخب رام نراین بنام
ہر کہ بنامش فگند از میان
ظالم و بیرحم بود بی کمان
ور تو زتاریخش خواہی نشان
منتخب بی بدل اورا بخوان
نمی ترسم زدست رند و قلاش
ولی چون ترسم از تصحیف وتحریف
نگہ دار از جفای نیم ملاش

رام نرائن حاجی پوری نے اپنے آبائی وطن حاجی پور (ویشالی) کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں

کیا ہے:

بیست و پنج سال کہ ریعان بہار شباب بود در شہر فردوس مظہر حاجی پور کہ مردش رضوان است و زنش حور و خاکش کافور است و سبزہ اش سمور عشرت پیرا بودہ۔

☆☆☆

فارم IV (رول نمبر ۸)

نام پریس :	معارف پریس، اعظم گڑھ	نام پبلشر :	ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی
مقام اشاعت :	دار المصنّفین اعظم گڑھ	قومیت :	ہندوستانی
وقفۂ اشاعت :	ماہانہ	پتہ :	دار المصنّفین اعظم گڑھ
نام پرنٹر :	ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی	ایڈیٹر :	ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
قومیت :	ہندوستانی	قومیت :	ہندوستانی
پتہ :	دار المصنّفین اعظم گڑھ	پتہ :	دار المصنّفین اعظم گڑھ

نام و پتہ مالک رسالہ: دار المصنّفین اعظم گڑھ

میں ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں

وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

علی ہمدانی، شاعری اور چہل اسرار

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

dr.raisahmadnomani@gmail.com

نقطۃ الدائرۂ غزل فارسی یعنی حافظ شیرازی کے معاصر و ملاقاتی شیخ علی ہمدانی سے منسوب اکتالیس (۴۱) غزلوں پر مشتمل ایک مختصر سا دیوان ہے جو ''چہل اسرار'' کے نام سے معروف ہے اور مختلف اوقات میں مختلف مقامات سے متعدد بار اشاعت پذیر ہو چکا ہے، لیکن کوئی اشاعت ایسی عمل میں نہیں آئی جس کی صحت پر اعتبار کیا جا سکے۔ اس صورت حال کے تناظر میں ''جموں و کشمیر اسلامک ریسرچ سینٹر'' سری نگر، کشمیر کے علم و ادب دوست ڈائریکٹر جناب عبدالرحمان کوندو صاحب نے کئی سال کی کاوش و جستجو اور ایک معقول رقم خرچ کر کے اس کتاب کے بہت سے مطبوعہ نسخے اور مخطوطات کے عکس فراہم کیے، پھر کافی دیدہ ریزی کے ساتھ ان کا مطالعہ کر کے اور مقابلہ و موازنہ کے مرحلے سے گزار کر ایک عمدہ نسخہ تیار کیا اور اس کو چھپوانے کا پختہ ارادہ کر لیا، تو ان کے دل میں شدید داعیہ پیدا ہوا کہ اگر اس متنِ متین کے ساتھ اس کا آسان ترین ترجمہ بھی شائع ہو جائے تو علی ہمدانی کے قدر دانوں اور عام کتاب خوانوں کے حق میں بھی سودمند ہوگا اور اس دردسری کے لیے خدا جانے کیوں ان کی نظر انتخاب راقم الحروف کے نام پر ٹھہری اور بار بار اصرار کر کے بالآخر مجھ سے ''چہل اسرار'' کا ترجمہ لکھوا کر ہی دم لیا۔

شیخ علی ہمدانی: ''چہل اسرار'' کے مصنف علی بن شہاب بن محمد بن علی حسینی ہمدانی، آٹھویں صدی ہجری کے ایک بڑے عالم و فاضل اور بڑے سیاح تھے۔ وہ رجب ۷۱۴ھ کی بارہ (۱۲) تاریخ کو ایران کے شہر ہمدان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا شجرۂ نسب والد اور والدہ دونوں کی طرف سے حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما پر منتہی ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم (شہاب الدین محمد) اور خالو (علاء الدولہ سمنانی) وغیرہ سے حاصل کی، پھر شیخ ابوالمیامن نجم الدین محمد بن موفق اذکانی سے دیگر علوم کے ساتھ

خصوصی طور پر علم حدیث کا درس لیا، پھر ۲۰-۲۲ برس کی عمر میں دنیا کی سیاحت کے لیے نکل گئے اور مشہور روایت کے مطابق تین بار اس نگار خانہ عالم کی سیر کی۔ سیر وسفر کے دوران چودہ سو کے قریب علماء و مشائخ سے ملے اوران کے علوم ومعارف سے فیض یاب ہوئے، پھر جب لوٹ کر خراسان آئے تو وہاں امیر تیمور گورگان سے ''حکمت'' کے مفہوم پر مناقشہ ہوا، جس سے بددل ہوکر (یا ایک روایت کے مطابق کسی غیبی اشارے پر) ۷۷۰ھ یا ۷۸۰ھ میں اپنے سات سو ہم نژاد اور ہم مشرب رفقا کے ساتھ وارِدِ کشمیر ہوئے اور یہاں اپنے خاص انداز میں تبلیغ واشاعت اسلام میں مشغول ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی جدوجہد میں تاثیر عطا فرمائی اور اس وقت کے باشندگان کشمیر کی اکثریت نے ان کے دست مبارک پر اسلام قبول کرلیا۔ شیخ علی ہمدانی نے کشمیر میں بہت سے مدرسوں کی بنیاد ڈالی، مسجدیں بنائیں اور کتاب خانے قائم کیے جن سے اس خطے میں اسلامی تہذیب وثقافت کو فروغ حاصل ہوا۔ قیام کشمیر کے زمانے میں بھی وہ وقفے وقفے سے ایران جاتے رہتے تھے۔ آخری بار ۷۸۶ھ میں وہ سفر پر نکلے تو راستے میں بیمار ہوگئے اور پاغستان کے مقام ''تیراہ'' میں ان کی وفات ہوگئی، وہاں سے ان کے جسد خاکی کو بدخشاں لے جایا گیا اور ختلان میں ان کی تدفین عمل میں آئی، کیونکہ ان کے والد کی قبر بھی ختلان ہی میں تھی۔

بڑے سیاح اور عظیم مبلغ ہونے کے ساتھ ساتھ علی ہمدانی بڑے مصنف بھی تھے۔ ان کی چھوٹی بڑی عربی وفارسی تصنیفات وتالیفات کی تعداد ۱۷۰ کے آس پاس بتائی جاتی ہے، جن میں غالباً بہت سی ضائع ہوچکی ہیں۔ ڈاکٹر محمد ریاض نے اپنے تحقیقی مقالے میں ان کی (۶۱) کتابوں کا تذکرہ کیا ہے اور علامہ عبدالحی حسنی نے اپنی مشہور ومقبول آفاق کتاب نزہۃ الخواطر میں لکھا ہے: ''وله مصنفات ممتعه ، يذكر منها ما طالعته بعون الله و توفيقه'' اس کے بعد ان کی ۴۴ کتابوں کے نام لکھے ہیں اور مختصر تعارف بھی کرایا ہے، جو خود ان کے مطالعے سے گزری تھیں۔

شاعری: ہمارے نزدیک شاعری اگر کچھ لوگوں کے لیے وقت گزاری کا مشغلہ ہے تو کچھ لوگوں کے لیے ایک نظریہ وعقیدہ ہے، بعضوں کے لیے یہ تفریح اور نفسانی وشہوانی تلذذ کا ذریعہ بھی ہے تو کچھ کے لیے سوز دروں کی تبرید وتسکین کا وسیلہ بھی بن جاتی ہے۔ بہرکیف شاعری کا بڑا حصہ وہی ہے جو مخرب اخلاق موضوعات کو کہیں کنایہ واستعارہ کے قالب میں اور کہیں بے حجابانہ انداز میں بیان کر کے سوسائٹی

کوفکری گندگی و پراگندگی اور ذہنی اوباشی وعیاشی میں مبتلا کرنے کا ذمہ دار ہو جاتا ہے۔اس عموم میں ثقہ، صوفی اور مصلحین کے نام بھی مل جاتے ہیں۔جیسے شیخ سعدی شیرازی اور امیر مینائی اور غلام علی آزاد بلگرامی وغیرہ ان کے کلام میں ایسے پست اور سوقیانہ مضامین بھی ہیں جن کی بے حیائی، ہر شریفانہ نگاہ کو جھکنے پر مجبور کر دیتی ہے اور جن کو نقل کرنے سے قلم کو بھی عار کا احساس ہونے لگتا ہے۔

ویسے ہر کلیے میں استثنا بھی ہوتا ہے۔شاعری کا ایک بہت مختصر سا حصہ وہ بھی ہے جس میں شعوری طور پر معاشرے کو کوئی اچھا پیغام دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اس سے اخلاق عامہ پر کچھ مثبت اثر پڑے گا۔اسی وجہ سے شاعری کو ''تخریبی'' اور ''تعمیری'' دونوں صفات سے متصف کہا جاتا ہے (یہاں میں نے قصداً تخریبی پہلے اور تعمیری بعد میں لکھا ہے)۔

اسلام اور شاعری: اسلام (جو تمام بنی نوع انسان کا پیدائشی مذہب اور دائمی منشور حیات ہے وہ) ''مطلق شاعری'' کی تائید اور تحسین نہیں کرتا، قرآن مقدس کا یہ بیان نا قابل انکار حقیقت ہے جو بے قید شاعری پر ایک جامع تبصرہ بھی ہے۔

والشعرآء یتبعھم الغاؤن۔ الم ترانھم فی کل وادیھیمون، وانھم یقولون مالا یفعلون ۔

(شاعروں کی باتوں پر تو بد راہ لوگ چلا کرتے ہیں، کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو وہ کرتے نہیں) سورۃ الشعراء آیت ۲۲۴-۲۲۶

ان آیات کی تفسیر میں مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ یہاں کچھ خاص خاص اقتباسات نقل کیے جا رہے ہیں:

۱۔ ......اسلام کے دربار میں کوئی کرسی ہرگز شاعروں کے لیے نہیں، اس لیے کہ عام شاعری میں بجز خیال آرائی اور مبالغہ پروری کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ (تفسیر ماجدی، جلد۵، ص۶۶)

۲۔ العلم ان الا یات الدالة علی تقبیح الشعر اء اکثر من ان تحصٰی (تفسیر احمدی ص ۵۸۶، تفسیر ماجدی، جلد۵، ص۶۶)

(جان لو کہ شاعری کی برائی پر دلالت کرنے والی آیات شمار سے باہر ہیں)

۳۔ واستدل بالاٰیة علی ذم الشعر والمبالغة فی المدح و الھجووغیرھما من فنونه (روح المعانی جلد۱۹، ص۱۴۷، تفسیر ماجدی، ج۵، ص۶۶)

(اس آیت سے شاعری اوراس کے فنون میں سے مدح اور ہجو میں مبالغے وغیرہ پراستدلال کیا جاتا ہے)

۴۔ و الشعراء عام ،یدخل فیه کل شاعر والمذموم من یهجو ویمدح شهوة محرمة ویقذف المحصنات ویقول الزور و مالا یسوغ شرعاً (بحرالمحیط ،جلد ۷،ص ۴۸، ماجدی، جلد ۵،ص ٦٦)

(''شعراء' عام ہے اس میں ہر شاعر داخل ہے۔اور براشاعر وہ ہے جو کسی کی ہجو کرتا ہے۔اور حرام شہوت کی تعریف اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتا ہے اور جھوٹی اور ایسی باتیں کہتا ہے جو شرع میں ناجائز ہیں)

۵۔ ....شاعر خواہ کتنا ہی مشہور کیوں نہ ہو، اس کے کلام سے تو اوباش اور عیاش قسم کے لوگ ہی متاثر ہوتے ہیں۔(ترجمان القرآن، جلد سوم، ص ۱۴۳)

۶۔ شاعروں کی شاعری بے مقصد ہوتی ہے۔وہ صرف اپنے واردات کو نمایاں کر کے ذہنی عیاشی کے لیے شعر کہتے ہیں، نیک و بد ہر قسم کے مضامین باندھتے پھرتے ہیں۔(ترجمان القرآن، جلد ۳،ص ۱۴۳)

۷۔حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اشعار بھی اپنی تقریروں میں استعمال فرماتے تھے؟ انہوں نے فرمایا، شعر سے بڑھ کر آپؐ کو کسی چیز سے نفرت نہ تھی۔(تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۵۴۸)

۸۔ ایک روایت کے مطابق کچھ ایسے الفاظ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لأن یمتلیٔ جوف رجل قیحًا یریه خیر من ان یمتلی شعراً (اخره البخاری ۶۱۵۵)

(اگر کسی شخص کا شکم پیپ سے بھرے تو اس سے بہتر ہے کہ شاعری سے بھرے)

كان الشعرُ ابغض الحديث الى النبى صلى الله عليه وسلم ۔

(مسند احمد ابن حنبل، جلد ۶،ص ۳۴، ۱۴۸، ۱۸۸ ،مسند طیالسی حدیث نمبر ۱۴۹، مفتاح کنوز السنۃ، ص ۲۵۵)

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک شاعری سب باتوں سے زیادہ نفرت انگیز تھی)

۱۰۔ ''مفتاح کنوز السنۃ'' کے مؤلف نے کتب احادیث کے مندرجہ ذیل مقامات کی نشاندہی کی

ہے جہاں شعر و شاعری کی مذمت بیان ہوئی ہے:

صحیح البخاری: کتاب الادب، صحیح مسلم: کتاب الشعر، سنن ابی داؤد، کتاب الادب، سنن الترمذی: کتاب الادب، سنن الدارمی: کتاب الاستئذان، سنن ابن ماجہ: کتاب الادب، مسند احمد بن حنبل، جزء اول: ص ۱۷۵، ۱۷۷، ۱۸۱

جزء ثانی: ص ۳۹، ۹۶، ۲۳۳، ۲۸۸، ۳۳۱، ۳۵۵، ۳۹۱، ۴۷۸، جزء ثالث: ص ۸، ۴۱، جزء رابع: ص ۹۸، ۱۲۵، ۴۲۱، جزء سادس: ص ۱۳۴، ۱۴۸، ۱۸۸، مسند الطیالسی - حدیث نمبر: ۲۰۲، ۱۴۹۰

۱۱۔ جو مسلمان نماز جمعہ مسجد میں پڑھتے ہیں اور نماز سے پہلے امام کا خطبہ بھی سنتے ہیں۔ انہوں نے بارہا خطبے میں یہ مشہور حدیث ضرور سنی ہوگی: الشعر من مزامیر ابلیس (شاعری شیطان کی راگنی ہے)

بہرحال جیسا کہ کہا گیا ہے کہ استثنا ہر کلیے میں ہوتا ہے، شاعری بھی اس استثنا سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

گذشتہ سطور میں ہم نے قرآن کریم کی جو آیات نقل کی ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

''شاعروں کی اتباع گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں اور وہ ہر وادی میں حیران و سرگرداں پھرا کرتے ہیں اور مستقل طور پر جھوٹ بولتے رہتے ہیں'' (یعنی شاعر لوگ بدراہوں، گمراہوں، آوارہ گردوں، جھوٹ بولنے والوں کے لیڈر ہوتے ہیں)۔ ان آیات کے ساتھ ہی ایک دوسری آیت بھی نازل فرمائی گئی ہے:

اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا وَّ انۡتَصَرُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا وَسَیَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَیَّ مُنۡقَلَبٍ یَّنۡقَلِبُوۡنَ (الشعراء آیت ۲۲۷)

۱۔لان لِـمُتَـلَئُ جوفُ رجلٍ یدیُه خیرٌ أن یمُتلی شعراً الراوی : ابوهریرة ،رواه مسلم: ۲۲۵۷، اخرجه البخاری: ۶۱۵۵۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ آلوسی نے لکھا ہے:

و جوازه فی الزهد والادب، ومکارم الاخلاق، وجواز الهجو لمن ظلم انتصاراً

(روح المعانی جلد: ۱۹ ص ۱۴۷، تفسیر ماجدی، جلد ۵، ص ۶۷)

(زہد (دنیا سے بے رغبتی)، ادب (شایستہ شعاری)، مکارم اخلاق (اخلاقی خوبیوں) کے متعلق مضمون نظم کرنا اور اسی طرح مظلوم کی مدد کے طور پر ظالم کی ہجو کرنا جواز کے دائرے میں آتا ہے)

اس آیت کے تعلق سے ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا یہ فٹ نوٹ بھی ذہن نشین کیے جانے کے لائق ہے:

یہاں شعراء کی عام مذمت سے جو اوپر بیان ہوئی، ان شعرا کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار خصوصیات کے حامل ہوں:

اول یہ کہ وہ مومن ہوں، یعنی اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتابوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور آخرت پر یقین رکھتے ہوں۔

دوسرے یہ کہ اپنی عملی زندگی میں صالح ہوں، بدکار اور فاسق و فاجر نہ ہوں، اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہو کر جھک نہ مارتے پھریں۔

تیسرے یہ کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہوں، اپنے عام حالات اور اوقات میں بھی، اور اپنے کلام میں بھی یہ نہ ہو کہ شخصی زندگی تو زہد و تقویٰ سے آراستہ ہو مگر کلام سراسر رندی و ہوسناکی سے لبریز- اور یہ بھی نہ ہو کہ شعر میں تو بڑی حکمت و معرفت کی باتیں بگھاری جارہی ہیں۔ مگر ذاتی زندگی کو دیکھیے تو یاد خدا کے سارے آثار سے خالی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں یکساں مذموم ہیں۔ ایک پسندیدہ شاعر وہی ہے جس کی نجی زندگی بھی خدا کی یاد سے معمور ہو اور شاعرانہ قابلیتیں بھی اس راہ میں وقف رہیں جو خدا سے غافل لوگوں کی نہیں بلکہ خدا شناس، خدا دوست اور خدا پرست لوگوں کی راہ ہے۔

چوتھی صفت ان مستثنیٰ قسم کے شاعروں کی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ شخصی اغراض کے لیے تو کسی کی ہجو نہ کریں، نہ ذاتی یا نسلی و قومی عصبیتوں کی خاطر انتقام کی آگ بھڑکائیں، مگر جب ظالموں کے مقابلے میں حق کی حمایت کے لیے ضرورت پیش آئے تو پھر زبان سے وہی کام لیں جو ایک مجاہد تیر و شمشیر سے لیتا ہے۔ (تفہیم القرآن، ج۳، ص۴۴۹)

الغرض شاعری مطلقاً قابل مذمت اور لازم الاجتناب چیز ہے۔ البتہ اگر اس کو کسی نیک اور پاک مقصد کے لیے استعمال کیا جائے تو جواز کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے، جس کے سب سے اچھے نمونے حضرت حسان بن ثابتؓ اور حضرت کعبؓ بن مالک کے اس کلام میں پائے جاتے ہیں جو کفار و مشرکین کے شاعروں کی اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے متعلق بکواس کے جواب میں وجود پذیر ہوا۔ اگر چہ یہی بات نثر پر منطبق کی جاسکتی ہے کہ اگر نثر میں برہنہ نگاری اختیار کی جائے اور جھوٹے اور ناپاک خیالات و نظریات

کی ترجمانی میں ذہنی صلاحیت صرف کی جائے تو وہ بھی مذموم ہے۔مگر نثر کی بنیاد ان باتوں پر نہیں ہے۔ کچھ بدذات اہل قلم ہیں جو نثر میں بھی قلم کی حرمت کو پایمال کرتے ہیں......اس کے خلاف شاعری کی تو بنیاد ہی بیہودگی، آوارہ خیالی غلط گفتاری پر استوار ہے۔

چہل اسرار: یہ فارسی زبان کی ۴۱ غزلوں پر مشتمل ایک مختصر سا مجموعۂ کلام ہے جس کو کسی اللہ کے بندے نے الف بائی ترتیب پر ردیف وار مرتب کر کے دیوان کی شکل دے دی ہے۔ ۴۱ غزلوں کے مجموعے کا نام ''چہل اسرار'' کیوں ہے، ''چہل و یک اسرار'' کیوں نہیں؟ راقم الحروف اس سوال کا جواب مہیا کرنے سے قاصر ہے۔ اہل عقیدت ان غزلوں کا مصنف علی ہمدانی کو مانتے ہیں اور جب تک کوئی محقق ناقابل تردید دلائل کے ساتھ ان غزلوں کی نسبت کو کسی دوسرے شاعر کے ساتھ ثابت نہ کر دے اس وقت تک ان کو علی ہمدانی کا کلام تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا جانا چاہیے۔

چہل اسرار کی غزلوں کے وجود میں آنے کے متعلق جو طلسماتی کہانی بہت سی کتابوں میں درج ہے اسی کو کسی صحیح العقل اور سلیم الطبع انسان کا ذہن آسانی کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ یہ ایک الگ بحث ہے اور اس وقت ہمارے موضوع میں شامل نہیں۔

بالعموم تاریخ اور تذکرے کی کتابوں میں علی ہمدانی کی شاعری کا ذکر نہیں ملتا، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ تذکرہ نگاروں اور تاریخ نویسوں نے اگر کسی شخص کے شاعر ہونے کو نظرانداز کر دیا ہے تو حتماً اس کا شاعر نہ ہونا ہی تسلیم کر لیا جائے۔ علی ہمدان حافظ شیرازی سے دید و شنید رکھتے تھے اور صاحب ذوق اور اہل دل انسان تھے، ان کی شاعری کے ذکر سے متعدد قدیم وجدید مصادر ومراجع مزین ہیں:

۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج ۳ (فارسی ادب اول) ص ۱۷۲

۲۔ تاریخ نظم ونثر در ایران و در زبان فارسی جلد اول ص ۴، ۱۹۵

۳۔ تاریخ نظم ونثر در ایران و در زبان فارسی، جلد دوم، ص ۷۷۳

۴۔ فہرست مشترک نسخہ ھای خطی فارسی، جلد ۸، ص ۴۴۳

۵۔ فارسی گویان پاکستان، ص ۴

۶۔ مجمع النفائس جلد دوم، ص ۱۰۳۰

۷۔ فرہنگ سخنوران، ص ۴۰۴

''فرہنگ سخنوران'' کے مولف نے مندرجہ ذیل کتابوں کے حوالے دیے ہیں جن میں علی ہمدانی کی شاعری اور ان کے شاعر ہونے کا ذکر ان کو ملا ہے۔

۸۔ ہفت اقلیم، مخطوطہ کتاب خانۂ شخصی جعفر سلطان القرائی، اقلیم چہارم (زیر عنوان ہمدان)۔ امین احمد رازی

۹۔ مجالس العشاق (سلطان حسین بایقرا) ص ۱۳۴-۱۳۶

۱۰۔ مجمع الفصحا (رضا قلی ہدایت) ص ۳۴۰

۱۱۔ ریاض العارفین (رضا قلی ہدایت) ص ۱۰۹

۱۲۔ روز روشن (مظفر حسین صبا) ص ۴۶۸-۴۶۹

۱۳۔ سفینۂ خوشگو (خوش گو) حرف عین کے ذیل میں

۱۴۔ نفحات الانس (عبدالرحمٰن جامی) ص ۳۹۹-۴۰۰

مافی الکتاب: جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، علی ہمدانی حافظ شیرازی کے ہم عصر تھے اور تذکرہ نگاروں اور تاریخ نویسوں نے دونوں کی ملاقات کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ بھی کہ علی ہمدانی نے حافظ شیرازی کی شاعرانہ اصطلاحات کے متعلق ایک مختصر سا رسالہ بھی ''مرادات دیوان حافظ'' کے عنوان سے قلم بند کیا تھا، جس کا بظاہر منحصر بفرد نسخہ آج بھی برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس رسالے کی مائکروفلم، کتابخانۂ مرکزی دانشگاہ تہران (ایران) کی زینت ہے اور اس مائکروفلم کا عکس ڈاکٹر محمد ریاض کے تحقیقی مقالے ''احوال و آثار و اشعار میر سید علی ہمدانی'' کے آخر میں شائع ہوا ہے۔ ایسی صورت میں ہمدانی کے کلام پر شیرازی کے کم و بیش اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ان کے کلام میں حافظ کی شادابی و شگفتگی اور روانی کی آسانی سے نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ لیکن حافظ کی رندی و بے باکی اور طرفہ بیانی ان کے کلام میں تلاش کرنا بے سود ہے۔

اصلاً علی ہمدانی کی شاعری ان کے التہاب دروں کا بے ساختہ اظہار ہے، جو متعدد و متنوع ادراکات کا اپنے ظرف میں احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ مشہور و منفرد صاحب نظریہ و فلسفۂ وحدۃ الوجود کے مدوّن اول ابن عربی سے ذہنی و روحانی رشتہ رکھتے تھے اور انہوں نے ابن عربی کی مشہور کتاب ''فصوص الحکم'' کا ترجمہ بھی فارسی زبان میں کیا تھا۔ اس لیے ان کے کلام میں بھی ''وحدۃ الوجود'' جیسے (غیر اسلامی)

نظریے کی ترجمانی پر پوری توجہ پائی جاتی ہے۔ اور چونکہ بچپن میں علی ہمدانی نے اپنے خالو اور فلسفہ ''وحدۃ الشہوذ'' کے بانی شیخ علاء الدولہ سمنانی کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیے تھے۔ اس لیے ''وحدۃ الوجوذ'' کے ساتھ ساتھ ''وحدۃ الشہوذ'' کی جھلکیاں بھی ان کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ طالب ومطلوب اور محبّ ومحبوب کی خصوصیات، ان کے واردات ومعاملات اور محبت کی کیفیات وسریات کو لطیف الفاظ کے قالب میں ڈھالا ہے، اور خودسپردگی وجاں نثاری کے ثمرات واثرات سے بحث کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی محبت سراسر غیر مادی، روحانی اور ماورائی ہے، اس میں زمینیت تلاش کرنا بے سود ہے۔ انہوں نے فنا وبقا کے مسالک ومنازل اور ان کے اطوار واسرار پر بھی دادِ سخن دی ہے۔ انہوں نے نفاق وریا کاری کی مذمت بھی کی ہے۔ علم کی تعریف کی ہے اور اس کو مقاصد کے حصول کی کلید بتایا ہے، جہالت کی تحقیر کی ہے اور اس کو محرومیت وناکامی کا زینہ قرار دیا ہے۔ ہمدانی کی اکثر غزلیں تسلسل اور ایک معنوی ربط سے بہرہ ور ہیں۔ پوری کتاب میں روحانیت اور رموزیت کی فضا چھائی ہوئی ہے، جس کا صحیح ادراک اہل دل ہی کر سکتے ہیں۔

صفت ترجمہ: چہل اسرار کی عمیق معنویت میں ڈوبی ہوئی غزلوں کا سلیس اردو میں ترجمہ کرنا ایک مشکل ذمہ داری تھی۔ محض خدا کے فضل وکرم سے راقم اس سے عہدہ برآ ہو سکا۔ ورنہ اس کتاب کے متعدد ترجمے جو ماضی میں چھپ چکے ہیں ان میں سے ایک بھی قابل اعتماد نہیں ہے۔

اس ہیچ مداں نے کوشش کی ہے کہ ترجمہ آسان بھی ہو اور مکمل بھی ہو، نیز سابقہ تمام تراجم میں پائی جانے والی غلطیوں سے بھی پاک ہو۔ ترجمہ متن کے زیادہ سے زیادہ قریب رہے اور کسی دانشمند قاری کو یہ نہ کہنا پڑے کہ ''متن از آسمان وترجمہ از ریسمان''۔

***

مآخذ ومراجع

۱۔ القرآن الکریم کتاب اللہ العظیم

۲۔ احوال وآثار واشعار میر سید علی ہمدانی، ڈاکٹر محمد ریاض، اسلام آباد (پاکستان)، ۱۹۸۵ء

۳۔ آب کوثر، شیخ محمد اکرام، دہلی، ب ت

۴۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد سوم (فارسی ادب اول) پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء
۵۔ تاریخ نظم ونثر در ایران و در زبان فارسی جلد اول، پروفیسر سعید نفیسی، تہران (ایران) ۱۳۴۴ خورشیدی
۶۔ تاریخ نظم ونثر در ایران و در زبان فارسی، جلد دوم، پروفیسر سعید نفیسی، تہران (ایران) ۱۳۴۴ خورشیدی
۷۔ ترجمان القرآن، جلد سوم، مولانا ابوالکلام آزاد، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء
۸۔ تفسیر ماجدی، جلد سوم، مولانا عبدالماجد دریابادی، لکھنو، ۲۰۱۶ء
۹۔ تفہیم القرآن، جلد سوم، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء
۱۰۔ فارسی گویان پاکستان، ڈاکٹر سبط حسن رضوی، راولپنڈی (پاکستان) ۱۹۷۴ء
۱۱۔ فرہنگ سخنوران، ڈاکٹر ع۔ خیامپور، آذربایجان (ایران) ۱۳۴۰ خورشیدی
۱۲۔ فہرست مشترک نسخہ ھای خطی فارسی پاکستان، جلد ہشتم، احمد منزوی، اسلام آباد (پاکستان) ۱۹۸۶ء
۱۳۔ مجمع النفائس، جلد دوم، سراج الدین علی خان آرزو، اسلام آباد (پاکستان) ۲۰۰۶ء
۱۴۔ مفتاح کنوز السنۃ ترجمہ محمد فواد عبدالباقی، دہلی، ب ت
۱۵۔ نزہۃ الخواطر وبھجۃ المسامع والنواظر، جلد ثانی، مولانا عبدالحی حسنی، حیدرآباد (ہند) ۱۹۶۶ء

اخبار علمیہ

''الحب والجمال عندالعرب'' کا نیا ایڈیشن

زبان وادب اور تاریخ کے مشہور اسکالر احمد تیمور پاشا کا شمار جدید مصری ثقافت کے نمایاں اور ممتاز ترین علم برداروں میں ہوتا ہے۔ ۱۸۷۱ء سے ۱۹۳۰ء تک وہ کرد باپ اور ترک ماں کے پاس رہے۔ علمی وتنقیدی ورثہ کے احیاوارتقا میں ان کی تصنیفات وتالیفات کا اہم کردار رہا ہے۔ اس مناسبت سے لھجات العرب، التصویر عندالعرب، تصحیح قاموس المحیط، المنتخب فی الشعر العربی وغیرہ کتابیں خوب شوق اور دلچسپی سے پڑھی گئیں۔ ایک اور کتاب ''الحب والجمال عندالعرب'' نے بھی قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۱ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس میں مصنف نے محبت کے مفاہیم اور عشق کی تعریفوں اور شعرا، فلاسفہ اور بعض خلفا کے نزدیک ان دونوں کے مظاہر کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لینے کی کوشش کی تھی۔ محبت کی مشہور تعریفوں کا جائزہ لیتے ہوئے حماد الراوی کے حوالہ سے کتاب میں لکھا گیا ہے کہ ان سے محبت کے بارے میں پوچھا گیا کہ محبت کیا ہے تو انہوں نے جواب دیا ''وہ درخت جس کی اصل فکر ہے، جس کی جڑیں یاد ہیں، جس کی شاخیں سہر یعنی شب بیداری ہیں، جس کے پتے بیماری ہیں اور جس کا پھل موت ہے۔'' اس سلسلہ میں ابن حزم کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ''محبت مذاق سے شروع ہوتی ہے اور اس کا انجام سنجیدگی ہے'' اس دلچسپ کتاب کا نیا ایڈیشن دار اقلام عربیہ، قاھرہ سے حال ہی میں طبع ہوا ہے۔ یہ خبر الشرق الاوسط، سعودی عرب، ص ثقافہ وفنون، ۲۰۲۴ء پر شائع کی گئی ہے۔

فضائی آلودگی کی وجہ سے قبل از اموات

سنگاپور یونیورسٹی کے ایک مطالعہ میں کہا گیا ہے کہ انسانی صنعتی سرگرمیوں، جنگلوں کی آگ اور بعض دوسرے منابع وذرائع سے پیدا ہونے والی فضائی آلودگی سے ۱۹۸۰ء سے ۲۰۲۰ء کے درمیان دنیا بھر میں تقریبا ۱۳۵ملین موتیں قبل از وقت واقع ہوئی ہیں۔ فرانس پریس ایجنسی کے مطابق سنگاپور کی نانیانگ ٹیکنالوجی یونیورسٹی نے واضح کیا کہ بحر ہند کے قطب پر ماحولیاتی مظاہر (جو سمندر کی سطح کے درجۂ حرارت میں فرق کے نتیجے میں ایک اور قدرتی آب وہوا کا رجحان ہے) نے ہوا میں ان کے ارتکاز کو بڑھا کر آلودگی کے اثرات میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس موسمی تبدل کو قبل از موتوں کا اہم سبب مانا جارہا ہے۔ (صحیفۃ الوطن، بحرین ۱۱ جون ۲۰۲۴ ص ۱۶)　　　**ک،ص اصلاحی**

تبصرۂ کتب

مولانا ڈاکٹر محمد کفیل احمد ندوی (مرتب)، **مضامین مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاریؒ**، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۱۵۲، قیمت درج نہیں، سن اشاعت ۲۰۲۳، پتہ: ادارہ ترجمہ وتالیف ۱۵-H-۲۸، سرسید احمد روڈ کولکاتا-۱۴، موبائل: ۷۰۱۷۱۶۲۹۱۱۱اور مکتبہ علم وحکمت، محلّہ سکونت کلاں، بہار شریف، ضلع نالندہ، بہار-۸۰۳۱۰۱۔

مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاریؒ ابھی ماضی قریب تک کلکتہ کے مسلمانوں کے مذہبی اور سماجی رہنما ہی نہیں تھے، کلکتہ کی اعلیٰ علمی وتحقیقی شناخت کی حیثیت کے مالک تھے۔ عیدگاہ کی امامت اور علمی موضوعات کی اشاعت گویا ان ہی کے ذمہ تھی، مولانا سید سلیمان ندویؒ، دارالمصنّفین اور رسالہ معارف وبرہان سے بھی اسی نسبت علمی کا خاص ظہور ہوتا رہتا تھا۔ زندگی میں تو وہ حسب منشا کتابوں کو شائع نہ کرسکے لیکن اب ان کے لائق صاحبزادے مولانا طلحہ ندوی نے دیدہ زیب طباعت کے ساتھ ان پر اور ان کی کئی کتابیں شائع کردیں۔ زیرنظر کتاب بھی اسی طبع جدید کے سلسلہ کا ایک حصہ ہے جس میں سات مقالے ہیں، تین علم حدیث کے تعلق سے اور ایک کتاب الام کے حوالہ سے ہیں، دو مضمونوں میں ڈیانواں اور شکرانواں کے کتب خانوں کا خاص تعارف ہے اور آخری تحریر عورت اور اسلامی تعلیم کے عنوان سے ہے۔

فاضل مرتب کا یہ خیال درست ہے کہ یہ وقیع اور تحقیقی مقالے خاص اہل ذوق وعلم کے لیے ہیں۔ پہلا مضمون ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات دراصل سید صاحب کی ان تحریروں سے متاثر ہوکر لکھا گیا جو ہندوستان میں علم حدیث کے نام سے شائع ہوئیں اور جن سے پہلی بار تفصیل سے محدثین ہند کے وجود اور ان کی خدمات اور علم حدیث میں ان کی اولیات سے دنیائے علم وتحقیق میں ایک نئی بیداری آئی اور کئی محققین نے اس موضوع کو اپنے مطالعہ کا مرکز بنالیا۔ اس مقالہ میں بعض محققین کی دریافتوں کے بعد یہ بتایا گیا کہ اور کون سی کتابیں ہیں جن کا تذکرہ رہ گیا اور خاص طور پر ۱۸۵۷ء کے بعد کی بعض کتب حدیث کا وہ خاکہ پیش کیا گیا جو لکھنے والے کی نظر میں اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے سنگ میل ثابت ہوسکتا ہے۔

مولانا بہاریؒ نے بخاری ومسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ کے شروح ومتعلقات اور پھر اصول

حدیث، اسنادِ حدیث، تخریجات حدیث، تدوین وتاریخ حدیث، مسند امام احمد، بلوغ المرام، مؤطا امام مالک، مشکوٰۃ و دارقطنی، مسند امام اعظم سے اربعینات تک کل اکیس۲۱ قسموں کے تحت ہندوستانی کتب حدیث کی نشاندہی کر دی۔ یہ مضمون رسالہ برہان میں تین قسطوں میں ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا، ظاہر ہے ان معلومات پر اوراضافہ ہو چکا ہے لیکن قریب ستّر برس پہلے ان معلومات نے ایک نئی دنیا کی نشان دہی جس طرح کی اس کی قدر و قیمت کا اندازہ آج بھی کیا جا سکتا ہے۔ کتاب الام والا مضمون بھی مولانا کی دقت نظر اور وسعت مطالعہ کا اور کتاب کے کما حقہٗ تعارف کا عمدہ نمونہ ہے۔ مسند احمد اور امام دارقطنی والے مضامین کے لیے بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔

دو تحریریں کتب خانوں کے تعلق سے ہیں، ایک مولانا شمس الحق دیانوی کا کتب خانہ ہے دوسرا شکرانواں کے مولانا رفیع الدین کا ہے۔ ان کی تفصیل اسلامی ہند کی عظمت رفتہ کی وہ داستان ہے جس کو سننے اور جاننے سے وہ احساس زیاں بڑھ جاتا ہے جو حکومت واقتدار کے جانے سے بھی محسوس نہیں ہوتا۔ یہ کتب خانے تھے یا اسلام کی علمی خدمات کے صدیوں سے گواہ۔ شکرانواں میں تفسیر جریر طبری کا کامل نسخہ تیس جلدوں میں تھا اور یہ پوری دنیا میں صرف تین کامل نسخوں میں سے ایک تھا۔ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کا علمی ذخیرہ جتنا بڑا یہاں جمع تھا، ہندوستان میں کہیں اور نہیں تھا۔ مولانا ابوسلمہ نے جس طرح اس کا تعارف کرایا وہ اصلاً علوم اسلامی کے محققین پر احسان سے کم نہیں۔ آئینۂ ایام میں اپنی ادا دیکھنے اور دکھانے کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوئی، اس لحاظ سے یہ مجموعۂ مضامین بہت قیمتی ہے، لائق مرتب نے ایک اچھے مقدمہ کے ساتھ اپنی تالیفی صلاحیت ظاہر کر دی ہے۔ البتہ کمپوزنگ کے اغلاط کا شکوہ نہ چاہتے ہوئے بھی کرنا پڑتا ہے، خصوصاً علمی کتابوں میں اس شعبہ پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ **(عمیر الصدیق ندوی)**

ابورفقہ محمد افروز قادری چریاکوٹی، **قاموس الخواتین**، (مشاہیر خواتین اسلام کی سوانحی فرہنگ، جلد سوم) متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۸۷، قیمت درج نہیں، سن اشاعت ۲۰۲۲، پتہ: نعمانی بک ڈپو، چریاکوٹ، مئو، پن ۲۷۶۱۲۹، موبائل: ۹۹۳۵۴۶۵۱۸۲۔

تصنیف وتالیف کی دنیا بھی عجیب ہے، اگر دنیا کی حیرت انگیزیوں کی باتیں ہوتی ہیں تو قلم وقرطاس کی حیرت زائیوں کی بھی کمی نہیں اور اس کی تازہ مثال یہ کتاب ہے، اگرچہ یہ تیسرا حصہ ہے، پہلے دو حصے ہماری نظر سے نہیں گزرے لیکن زیر نظر حصہ میں ان کی فہرست کی شمولیت نے زیادہ افسوس نہ ہونے

دیا۔ اس تیسرے حصہ میں حرف فاء سے یاء تک شروع ہونے والیوں کا نام اور کام دیا گیا۔ پہلے حصہ میں ترتیب زمانی کے لحاظ سے قبل مسیح کی خواتین اسلام کا ذکر ہے، حروف تہجی کے اعتبار سے حضرت آسیہ زوجہ فرعون سے یہ سلسلہ شروع ہوا، پھر پہلی صدی ہجری سے اب تک کی ان مسلمان خواتین کا شمار ہے جو کسی بھی خصوصی قطار میں نظر آتی ہیں۔ حضرت حواؑ سے ثانیہ مرزا تک یہ فہرست معلومات کی فراوانی کو عالم حیرانی تک پہنچانے میں جس طرح کامیاب ہے، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس حصہ میں کوئی مقدمہ یا پیش لفظ نہیں ہے جس سے فاضل مصنف کی غرض وغایت اور اس کتاب کی تیاری میں پیش آنے والی مشکلات کا بیان سامنے آجاتا، پہلے حصہ کے مقدمہ ہی کو حذف وترمیم سے پیش کر دیا جاتا تو بھی کسی نئے پڑھنے والے کو کئی سوالوں کے جواب پانے میں آسانی ہوتی، مثلاً فرہنگ میں اردو کی محقق خواتین کے اجمالی گوشوارہ کی یہاں کیا ضرورت تھی، اگرچہ یہ بذاتِ خود بہت کارآمد ہے۔ مرتب کے متعلق اس حصہ میں کوئی تحریر نہیں، بس فہرست کے ضمن میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیپ ٹاؤن جنوبی افریقہ کی ایک یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔

چریاکوٹی کی نسبت البتہ ان کے علمی ذوق اور تحقیقی شوق اور ژرف نگاہی کی صلاحیت کی توثیق کے لیے کافی ہے، چریاکوٹ کی بستی اعظم گڑھ اور مئو کے نواح میں کبھی ہندوستان کے یونان کی حیثیت سے جانی جاتی تھی۔ مولانا فاروق اور پھر مولانا شبلی کی نسبتوں نے اس یونان کو آسمان بنا دیا۔ اس کتاب کے لائق مرتب کی اس قابل قدر کوشش نے پھر سے یہ حقیقت ظاہر کر دی کہ "یہ مٹی بہت زرخیز ہے"۔ **(ع۔ص)**

پروفیسر محمد طاہر، **صحابیات اور نسائی تحریکات**، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۳۳۱۔، سن اشاعت :۲۰۲۳ء، قیمت درج نہیں۔ موبائل نمبر:۹۴۵۴۴۱۶۸۷۸۶، ای میل: tahirsnc@yahoo.in۔

اس بے حد مفید اور قابل مطالعہ کتاب کے مرتب کی سب سے بڑی امتیازی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے شعبہ اردو کے تحت امہات المومنینؓ وصحابیاتؓ کی پاکیزہ اور لائق تقلید باتوں کو ادب کے واسطے سے عام کرنے کی مہم شروع کی، سات برس تک مسلسل قومی اور بین الاقوامی سیمینار اسی موضوع کے لیے خاص کیے گئے۔ سیمینار کے مقالات صرف اردو ہی نہیں ہندی، انگریزی اور کشمیری وعربی زبانوں میں شائع ہوئے۔ شبلی کالج کے شعبہ اردو میں طالبات کی بڑی تعداد کو علم حقیقی سے آراستہ کر کے عمل کی دنیا

میں روشنی بکھیرنے والی دنیا کی نصف آبادی کی تربیت ان سیمیناروں کی منزل مقصود تھی۔ جذبہ یہ تھا کہ موجودہ عہد میں نسائیت کا نعرہ اور نسائی تحریکات کا زور اپنے شباب پر ہے اور پرفریب نعروں کے دام میں خواتین گرفتار ہوکر گمراہیوں کا زیادہ شکار ہورہی ہیں، ایسے میں سیرت صحابیات سے واقف کرانا ضروری ہے کہ ایسا معاشرہ وجود میں آئے جس میں خواتین کے لیے زندگی باعزت طریقہ سے گزارنے کا ماحول ہو۔ فاضل مرتب نے لکھا کہ نسائی تحریکات کا کوئی ایسا مطالبہ نہیں جو اسلام نے چودہ سوسال قبل ہی تسلیم نہ کرلیا ہو اور جس کا کامیاب ترین عملی نمونہ سیرت صحابیات میں ملتا ہے۔ یہی وہ پرخلوص جذبہ تھا جس کے نتیجہ میں عمدہ مقالات اور خطبات سے کئی عمدہ کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی۔ زیرنظر کتاب میں پروفیسر مزمل حسین کے خطاب میں نسائی تحریکات اور اختیارات نسواں کے تناظر میں صحابیاتؓ کے کردار پر جدید لب ولہجہ میں گفتگو کرتے ہوئے بتایا گیا کہ عورتوں کے حقوق کی ادائیگی میں جو کچھ چند سوسال پہلے کیا گیا، اسلام نے وہ سارے حقوق زیادہ بہتر شکل میں چودہ سوسال پہلے عطا کردیے تھے۔ کلیدی خطبہ میں شیخ ابوزید ضمیر نے بھی بڑی تفصیل سے اسلام کے عطا کردہ حقوق کو پیش کیا، موضوع کے تعلق سے لکھنے والوں میں مقالہ نگار خواتین برابر کی تعداد میں ہیں اور یہ اس کتاب کا بڑا خوشگوار اور زیادہ متاثر کن پہلو ہے۔ جس نے اپنے موضوع پر اس کتاب کو انفرادیت عطا کردی۔ برسوں سے بوجوہ یہ سیمیناری سلسلہ موقوف ہے۔ اسے جاری رہنا چاہیے۔ **(ع۔ص)**

ڈاکٹر شکیل احمد، **مٹھی بھر خطوط** (میرے نام)، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع معنی خیز گردپوش، صفحات ۲۴۰، قیمت ۳۰۰ روپے، سن اشاعت ۲۰۲۳، پتہ: ڈاکٹر شکیل احمد، ڈومن پورہ، مئوناتھ بھنجن، پن نمبر ۲۷۵۱۰۱، موبائل: ۹۲۳۶۷۲۲۵۷۰، اور مکتبہ الفہیم، صدر چوک، دھوبیا املی روڈ، مئوناتھ بھنجن (یو، پی)۔

تاریخ عالم کے خاص مصادر میں آثار مکتوبہ کا ذکر خاص طور پر کیا جاتا ہے کہ غاروں میں، پتھروں اور درختوں کی چھالوں اور چمڑوں کی کھالوں پر کبھی انسانی جذبات کا اظہار کیا جاتا تھا، اب وہ محض آثار بن کر رہ گئے۔ زمانہ کی رفتار دیکھ کر آئندہ شاید خطوط ومکاتیب کے بارے میں ایسا ہی کچھ کہا جائے گا۔ ایسے میں جنھوں نے خطوط کی اہمیت سمجھتے ہوئے ان کی حفاظت کی اور ان کو تلف ہونے سے بچایا، ان کے لیے یہ واقعی ضروری ہوگیا کہ ان خطوط کو طباعت کے حوالے کرکے ان کی حفاظت اور

ان سے استفادے کی سہولت کی فکر کریں۔ڈاکٹر شکیل احمد کے قلم کا سفر کچھ الگ رنگ رکھتا ہے، بادلوں سائبانوں سے ہوتا ہوا ان کا قلم کبھی اپنے نشاط وطراز کی خبر دیتا ہے تو کبھی سفر کی خوشبو بکھراتا ہے، وہ بنیادی طور پر افادی ادب کے قائل ہیں، اس افادی سفر میں انہوں نے ادیبوں، شاعروں، نقادوں، اور دوسرے اہل علم سے مسلسل رابطہ رکھا، جس کا گواہ خطوط کا یہ پیش نظر مجموعہ ہے، قریب نوے مکتوب نگار ہیں جن کے مکاتیب کو مٹھی بھر خطوط سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلے شاید یہ بات قلت اور تعداد کی کمی سمجھی جاتی تھی مگر اب تو دنیا ہی مٹھی میں آجاتی ہے، اس لیے اگر نوے اہل قلم کی تحریریں ایک جگہ مل جائیں تو اس سے اس کی افادیت اور لطف ولذت کی کثرت ہی ظاہر ہوکر رہتی ہے، اوٹیلا ناتھ اشک کے خطوط اس خوبی کی مثال ہیں جو سمجھاتے ہیں کہ ''اس وقت جو تنقید ہوتی ہے وہ محض دوسروں کی جوٹھن کھانے کے برابر ہے۔کوئی نقاد جو تنقید کے اعلیٰ اصولوں کے مطابق دیکھے پرکھے اور اس فن کے لیے ڈیڈیکیٹ ہو، اب اردو ہندی میں مفقود ہے''، سید حامد کے یہ الفاظ بھی اس مجموعہ کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتے ہیں کہ ''مسلمانوں میں شعور عام ہوتا اور اگر وہ تنظیمی صلاحیت بھی رکھتے تو رہائشی نو آبادی ان کی اولین ترجیحات میں ہوتی، اس کے فوائد بے شمار ہیں، تامل نہ کیجیے، ہم تامل، تذبذب، تاخیر کے اسیر ہوکر رہ گئے ہیں''۔

اکثر مکتوب نگاروں کے ادبی خطوط کا عکس اس لحاظ سے بھی دلچسپ ہے کہ ان کے ذریعہ خوش خطی کی کئی خوبصورت شکلیں نگاہوں کو خوش کر جاتی ہیں۔ (ع۔ص)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، **کلیری فکیشن آف ان وارنٹڈ آبجیکشن آن اسلام**، جے، ایس افتخار (مترجم) کاغذ وطباعت عمدہ، غیر مجلد، صفحات ۵۹۰۔المعہد العالی الاسلامی، تعلیم آباد قبا کالونی، شاہین نگر حیدرآباد، ۵۰۰۰۰۵، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت درج نہیں۔موبائل نمبر وای میل: درج نہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندین اسلام کی جانب سے چھوٹے بڑے ہر قسم کے اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ مذہب بے زار اہل مغرب نے شروع کیا اور اب بعض فرقہ پرست طاقتیں یہ کوڑا ہندوستان میں لا رہی ہیں۔جس کا مقصد اسلام کی شبیہ کو داغدار کرنا، مسلمانوں کے خلاف دشمنی پیدا کرنا اور غیر مسلموں کی برین واشنگ کرنا ہے۔مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی کتاب ''اسلام پر بے جا اعتراضات'' کا انگریزی ترجمہ پیش نظر ہے۔اس میں نہ صرف ناقدین کے

شکوک وشبہات کو دور کیا گیا ہے بلکہ مسلمانوں کے اندر اپنے ایمان وعقیدہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے کا داعیہ پیدا کیا گیا ہے۔مولانا کے بہ قول انہوں نے اس کتاب میں ان منتخب سوالات کے کافی وشافی جوابات دینے کی کوشش کی ہے جو زیادہ تر ذرائع ابلاغ میں موضوع بحث اور خاص طور پر ہندوستان میں نفرت پھیلانے کے لیے استعمال ہورہے ہیں۔ پہلا باب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کے بارے میں اٹھائے گئے سوالات سے متعلق ہے۔دوسرا پیغمبر اسلام کی مقدس زندگی اور تیسرا شرعی قوانین اور چوتھا ہندوستان کے مسلم حکمرانوں اور ان کی حکومت پر وارد کیے گئے اعتراضات کے جواب میں ہے۔کتاب میں پہلے اسلام میں جنگ کے اصولوں اور تصور جہاد پر قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں کے تصور وقواعد جنگ کا تجزیاتی مطالعہ ان کی مذہبی کتابوں کی روشنی میں کیا گیا ہے۔جزیہ پر اعتراضات کی حقیقت بھی واضح کی گئی ہے اور آخر میں لکھا گیا ہے کہ اس کا مقصد انتظامی اور دفاعی ضروریات کو پورا کرنا ہے۔غیر مسلموں کے لیے جزیہ اصل میں زکوٰۃ کا نعم البدل اور ان کی حفاظت کا معاوضہ ہے۔اگر اسلامی اصولوں کی اتباع کرنے کے لیے ان سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی تو یہ مذہبی آزادی کے خلاف اور ان کی ذلت ورسوائی کا باعث ہوگا اور اسلام کو یہ بات پسند نہیں۔جزیہ کی مقدار بھی بہت معمولی ہوتی تھی۔(ص۱۸۲) عہد نبوی اور جہاد کے تحت ہندوؤں اور عیسائیوں کی جنگوں کا چشم کشا موازنہ اسلام کی ابتدائی جنگوں سے کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ مدنی دور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ۸۲ جنگیں ہوئیں جن میں دونوں طرف سے مجموعی طور پر ۱۰۱۸ افراد مارے گئے۔اوسطاً ہر جنگ میں ۱۱ جانیں گئیں۔یہ جنگیں زیادہ تر مدینہ کے قریب ہی لڑی گئیں،اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان حملہ آور نہیں تھے۔اس کے برخلاف مہابھارت کی مقدس جنگ میں ہندو ریکارڈ کے مطابق لاکھوں لوگ مارے گئے۔ایک عیسائی عدالت نے ایک اعشاریہ دو کرور لوگوں کو سزائے موت سنائی اور اس میں سے ایک بڑی تعداد زندہ نذر آتش کی گئی۔افسوس کی بات ہے کہ معترضین بالخصوص اہل مغرب جن کی تاریخ قتل وخوں ریزی کی خون آشام داستانوں سے بھری پڑی ہے وہ مسلمانوں کے باب میں لکھتے ہیں کہ ان کا دامن خون کی ہولیوں سے داغ دار ہے (ص۳۹۵)۔ ایک جگہ اسلام اور مسلمانوں پر انتہا پسندی کے الزامات اور اسلامی شریعت میں سزاؤں کا جائزہ لے کر یہ بتایا گیا ہے کہ انتہا پسندی کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے اور

سخت سزاؤں کا مقصد معاشرہ کی اصلاح اور اس میں بدامنی کی اشاعت کا خاتمہ کرنا ہے۔ بچپن کی شادی، تعدد ازدواج اور نکاح وطلاق کے مسائل پر اعتراضات کا جواب ان کی مذہبی کتابوں سے موازنہ وتقابل کرتے ہوئے دیا گیا ہے۔ اس سے قبل اس طرح کے بیشتر اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں لیکن ہر اعتراض اور اس کے منطقیانہ جواب کی جو تفصیل اس کتاب میں ملے گی وہ بہت کم کہیں اور ملے گی۔

اسلام اور مسلمانوں پر اعتراضات کا جواب دینے کے لیے جو بنیاد علامہ شبلی اور دارالمصنّفین نے فراہم کی ہے یہ کتاب اس میں اضافہ اور اسی سلسلہ کی عمدہ توسیع ہے۔ جواب کا لب ولہجہ اور اسلوب خیرخواہانہ ہے۔ مولانا اس خدمت کے لیے یقیناً اہل علم کے شکریے کے مستحق ہیں۔ مترجم صاحب کتاب کے علمی مقام ومرتبہ اور ان کی گوناگوں فقہی وادبی صلاحیتوں کے بڑے مداح اور اس شاندار کام کے ترجمہ کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہیں۔ اردو متن کے مزاج کی رعایت میں کتاب کے ادبی ذائقہ کو حتی الامکان برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے اردو ایڈیشن کی طرح انگریزی ترجمہ بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

(کلیم صفات اصلاحی)

ڈاکٹر ٹی ،آر ،رینا ،**رشید حسن خاں اور قاضی عبد الودود**، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد ، صفحات ۱۸۸، ملنے کا پتہ :شاردا کٹیر ایف ،۲۳۷،لوئر ہری سنگھ نگر، رہاڑی کالونی ، جموں ۱۸۰۰۰۵ سن اشاعت :۲۰۲۳ء، قیمت ۴۰۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۹۴۱۹۸۲۸۵۴۲۔
ایمیل :trrainaraina@yahoo.com

فاضل مرتب نے اس سے قبل رشید حسن خاں کے خطوط کی تین جلدیں اور مقالات کے چھ مجموعے جن میں تین شائع ہو چکے ہیں مرتب کر کے اہل علم سے خوب خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ ان جلدوں کے علاوہ انہوں نے رشید حسن خاں پر متعدد نوعیتوں سے کام کیا ہے۔ مثلاً رشید حسن خاں اور اردو محققین بیاض رشید حسن خان، رشید حسن خاں وظفر احمد صدیقی، رشید حسن خاں وحنیف نقوی وغیرہ اور اب اس کتاب نے ان کے اس اختصاص میں مزید چار چاند لگا دیا ہے۔ گویا رینا صاحب کی گزشتہ چودہ سالہ علمی وادبی خدمات کا زیادہ حصہ رشید حسن خاں کی علمی وتحقیقی کاوشوں کے تعارف واشاعت کے لیے وقف ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے خاں صاحب کے ایک ایک کام کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر منظر عام پر لانے کی ذمہ داری اپنے اوپر عائد کر رکھی ہے۔ اس جنون کے لیے وہ قابل مبارک باد ہیں۔ رشید حسن خاں محمود شیرانی کو اردو تحقیق کا

معلم اول اور قاضی عبدالودود کو معلم ثانی ہی نہیں بلکہ اپنے عہد میں اردو کا سب سے بڑا محقق مانتے ہیں۔ معلم ثانی کے تحقیقی وتنقیدی مقام ومرتبہ کے سلسلے میں ان کے جو خیالات تھے مرتب نے پہلے اپنے طویل اور پرمغز مقدمے میں ان پر گفتگو کی ہے۔ البتہ رشید حسن خاں سے عقیدت کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔

رشید حسن خاں بنیادی طور پر ان محققین کو بڑا تسلیم کرتے ہیں جن کی تربیت یورپ میں ہوئی ہے۔ ان کے نزدیک فارسی واردو میں تین بڑے محقق مرزا محمد قزوینی، حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود ہیں اور ان تینوں حضرات کی تربیت یورپ میں ہوئی.....تحقیق کے آداب واحوال کا صحیح معنی میں عرفان ان حضرات کو وہیں ہوا۔ (ص ۱۳) حالانکہ شیرانی کے متعلق وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ تصحیح کے اصول اور طریقۂ کار کی تفصیلات ان کے یہاں نہ کے برابر ہیں۔ وہ الفاظ کی کفایت شعاری سے بھی کام نہیں لیتے۔ کہیں کہیں انہوں نے روایتوں کو چھان پھٹک کے بغیر قبول کرلیا ہے (ص ۱۴)۔ البتہ قاضی صاحب کے تحقیقی نظریات کی حمایت اس حد تک کرتے ہیں کہ ان کے یہاں انہیں کوئی نقص ہی نظر نہیں آتا۔ ان کے مطابق قاضی صاحب نے تبصروں کے واسطے سے نئی نسل کو تحقیق کے آداب سکھائے۔ اصولوں کا عرفان بخشا اور احتیاط کی اہمیت بتائی (ص ۱۸۶)۔ تحقیق میں روایت وشخصیت پرستی کے خلاف آواز اٹھانے کو قاضی صاحب کا کارنامہ سمجھتے ہیں لیکن قاضی صاحب کے معاملہ میں وہ خود کو اس اصول کی زد سے نہیں بچا پائے ہیں۔ مقدمہ کے بعد دونوں محققین کے سوانحی وعلمی کوائف وحالات درج کیے گئے ہیں۔ قاضی صاحب کے نام خاں صاحب کے ۲۵ اور خاں صاحب کے نام قاضی صاحب کے ۴۵ خطوط بھی شامل کتاب ہیں۔ خطوط کے ذیل میں ریناصاحب نے توضیحی اور مفید حواشی بھی لکھے ہیں جن سے دونوں شخصیات کے مابین علمی وادبی اور ذاتی تعلقات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ آخر میں قاضی صاحب پر خاں صاحب کے تین مطبوعہ مضامین شامل ہیں جن سے قاضی صاحب کی تحقیقی وتنقیدی عظمت وبلند پائیگی ظاہر ہوتی ہے۔ کتاب میں ان کا یہ بیان بھی نظر پڑا ''مولانا شبلی بہت کچھ تھے مگر محقق نہیں تھے'' (ص ۱۷۲)۔ مرتب کا یہ کام اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ انہوں نے اپنے وقت کے بلند پایہ محقق قاضی عبدالودود کے متعلق رشید حسن خان کے خیالات وتأثرات جاننے کا عمدہ موقع فراہم کردیا ہے۔ تصحیح کی جانب کم توجہ دی گئی ہے۔

ک، ص اصلاحی

خواب نامہ

ڈاکٹر راہی فدائی

سبب تیرگی منوّر خواب   سج کے آتے رہے برابر خواب
کبھی پتھر ، کبھی تو گوہر خواب   تودۂ ذہنیت کا مظہر خواب
رنگ تعبیر کے کرشمے کھلے   مثل خورشید چمکا گھر گھر خواب
قسمتیں دائروں میں گھومتی ہیں   گردش خیر و شر کا محور خواب
کُل حجابات قلب دور ہوئے   لوح محفوظ کا ہے منظر خواب
زیب تن کرکے زرق برق بیان   بن گیا آج شان منبر خواب
نور آنکھوں بھرا تھا جس کے سبب   کاش! آجاتا وہ مکرّر خواب
نفع آور یہ خفتگی کا شجر   دیکھ! کیا خوب ہے ثمرور خواب
اس کے آگے حقیقتیں ہیں پست   کس قدر ہے بلند و برتر خواب
ڈوب کر لاشعور دریا میں   لائے گا موتیاں شناور خواب
نیند نے بھی سنی ، نہ آنکھ کھلی   آہٹیں دے رہا تھا در پر خواب
میں نے سکھلایا اس کو فنّ غزل   دیکھئے ہوگیا سخن ور خواب!
ہے اشارہ پیمبروں کے لیے   درحقیقت یہ حکم داور خواب
دل میں رکھتا ہے وہم کی بنیاد   بے سر و پا ہر اک ستم گر خواب
خوش بوؤں میں نہا گئی ہے روح   میں نے دیکھا تھا مشک و عنبر خواب
چیختا ہے رواں رواں تن کا   چبھ رہا ہے مثال نشتر خواب

رب تعالیٰ کا فضل ہے راہؔی!
میرے اشعار کا ہے رہ بر خواب

معارف کی ڈاک

''تفسیر نظام القرآن'' پر مراسلہ کا جواب

''تفسیر نظام القرآن کے بعض تاریخی پہلو'' کے عنوان سے معارف مارچ ۲۰۲۴ء میں راقم سطور کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔اس پر مئی ۲۰۲۴ء کے شمارے میں فاضل معاون رفیق دارالمصنّفین کا معترضانہ مراسلہ شائع ہوا۔اگر راقم سے رابطہ کر لیا گیا ہوتا تو معارف کے صفحات مزید بیش قیمت تحریروں کے کام آتے۔معارف کی گزشتہ صد سالہ تاریخ کی روایت بھی یہی رہی ہے کہ دارالمصنّفین کے کسی مضمون پر یہیں کے دوسرے رفیق کا مراسلہ شائع نہیں کیا جاتا تھا۔یہاں کے اہل قلم سے معارف میں اگر کوئی فاش علمی غلطی ہو جاتی تو اگلے شمارے میں اس کی تصحیح کسی مقالہ کے آخر میں خالی جگہ پر ''تصحیح'' یا ''قارئین تصحیح فرمالیں'' کے عنوان سے ایک دو سطر میں آجاتی تھی۔

مراسلہ میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔پہلی یہ کہ راقم نے مولانا فراہی کی ''تاریخ القرآن'' سے متعلق لکھا تھا کہ ''لیکن افسوس کہ اس کے متعلق اب تک مختصر معلومات ہی دستیاب ہوئی ہیں''۔اس پر مراسلہ نگار نے لکھا ہے کہ ''اس پر انہوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے''۔قارئین خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بات اصلاً حوالہ کی ہے ہی نہیں لیکن اگر حوالہ مطلوب ہی ہے تو حاضر ہے۔تفسیر نظام القرآن کے متعدد مقامات پر تاریخ القرآن کا تذکرہ موجود ہے۔مثلاً ''تفسیر سورہ قیامہ'' کے ذیل میں ایک جگہ ہلالین میں ہے (اس مسئلہ سے متعلق تفصیلی مباحث ہماری کتاب تاریخ القرآن میں ملیں گے[1]) لفظ تاریخ القرآن پر مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے حاشیہ میں لکھا ہے ''مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس نام سے بھی ایک کتاب لکھنی چاہی تھی لیکن کچھ متفرق فصلوں سے زیادہ اس کو نہ لکھ سکے تھے۔'' ایک جگہ سورہ والعصر کی تفسیر کے تحت مولانا فراہی کا یہ جملہ ہے۔''اس بات کو بالاجمال ہم تاریخ قرآن میں لکھ چکے ہیں[2]۔'' مولانا امین صاحب کا ''تاریخ قرآن'' پر پھر حاشیہ ہے۔''مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب نامکمل رہ گئی''۔اس کے علاوہ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی مرحوم نے اس سلسلہ میں جو مختصر معلومات ذکر فراہی میں بہم پہنچائی ہے

۱۔امام حمید الدین فراہی، تفسیر نظام القرن، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ ۲۰۰۹ء، ص ۲۵۸

۲۔ماخذ سابق، ص ۴۳۷

انہیں کو ذہن میں رکھ کر مذکورہ بالا خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ اس کے متعلق مختصر معلومات ہی دست یاب ہوئی ہیں۔تاریخ القرآن کے متعلق مولانا فراہی کے مذکورہ بیان، مولانا امین احسن اصلاحی کے دونوں جگہوں پر حواشی اور خود ڈاکٹر صاحب کی تحریر کو اگر سامنے رکھا جائے تو بات واضح ہوجاتی ہے کہ مولانا نے باقاعدہ اس نام سے نہ صرف تصنیف کی ابتدا کردی تھی بلکہ اس کے مباحث اور چند فصلیں بھی لکھ چکے تھے لیکن اس کو مکمل نہیں کر سکے تھے۔اس سے مراسلہ نگار کے اس خیال ''مولانا فراہیؒ نے ابھی صرف اس کتاب کا خاکہ ہی وضع کیا تھا۔اسے لکھ نہیں سکے تھے'' کی بھی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی۔

دوسرے حضرت عمرؓ کے قاتل فیروز ابولؤلؤ کے متعلق مولانا فراہی نے لکھا تھا کہ ''ان کو ایک نصرانی (عیسائی) نے شہید کیا تھا''۔اس پر مراسلہ نگار نے لکھا ہے کہ ''مولانا فراہی نے نظام القرآن (عربی) میں نصاریٰ لکھا ہے جس کے اردو ترجمے میں مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے کہ ''آپ کو ایک عیسائی نے شہید کیا'' (معارف ص ۷۷)۔قارئین سوچ سکتے ہیں کہ مولانا فراہیؒ فیروز ابولؤلؤ کے لیے جمع کا لفظ ''نصاریٰ'' لکھ سکتے ہیں؟ اور اس سے بھی بڑھ کر مولانا اصلاحی مرحوم ''نصاریٰ'' کا ترجمہ ''ایک عیسائی'' کریں گے؟۔مراسلہ نگار شوق اعتراض میں حوالہ کی عبارت بھی صحیح نقل نہیں کر سکے ہیں۔ مولانا فراہی نے ''قاتله نصرانی''[۳] لکھا ہے جس کا ترجمہ مولانا اصلاحی نے ''ایک عیسائی'' کیا ہے۔

مراسلہ نگار آگے لکھتے ہیں ''تاریخ اسلام کا ایک ادنی طالب علم بھی اس بات کو جانتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو فیروز ابولولو نے شہید کیا تھا، جو نصرانی یا عیسائی نہیں تھا بلکہ ایک مجوسی تھا''۔مراسلہ نگار کو یہ بھی اندازہ نہیں ہے کہ ان کے اس جملے میں ''تاریخ اسلام کا ادنی طالب علم'' کی نسبت مولانا فراہی جیسے جلیل القدر عالم اور ان کے تلمیذ رشید کی جانب ہو رہی ہے۔جہاں تک فیروز ابولؤلؤ کے مجوسی ہونے کی بات ہے تو ان کا یہ ''فیصلہ'' بے جا اصرار اور مطالعہ کی کمی پر مبنی ہے۔اس لیے کہ ابولؤلؤ کی دونوں حیثیتوں کے متعلق اس قدر روایتیں ہیں کہ اس مسئلہ کی حیثیت راجح اور مرجوح کی ہوگئی ہے۔جس نے جس قول کو راجح مانا اس کو اختیار کرلیا۔مصادر حدیث و تاریخ و سیر میں اس سلسلہ میں چار قسم کے اقوال پائے جاتے ہیں۔

پہلا کچھ لوگوں نے اس کو صرف نصرانی لکھا ہے اور اس کی مجوسیت کی جانب اشارہ تک نہیں کیا ہے۔ ابن عبدالحکم (م ۲۵۷ھ) لکھتے ہیں: انما قتله ابو لؤلؤۃ رجل نصرانی[۴]۔

۳۔تفسیر نظام القرآن (عربی) تفسیر سورہ والشمس، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، ایڈیشن ۲۰۰۹ء، ص ۳۲۷

۴۔عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن عبدالحکم، فتوح مصر والمغرب، مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ، ۱۴۱۵ھ، ص ۸۲

ابن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) لکھتے ہیں: فلقیه ابو لؤلؤة غلام المغیرة بن شعبة و کان نصرانیا[۵]۔
مقدسی (نحو ۳۵۵ھ) کا بیان ہے: کان للمغیرة بن شعبه غلام نصرانی[۶]۔
امام آجری (م ۳۶۰ھ) اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: عن المسور بن مخرمة عن امه و کانت عاتکة بنت عو ف قالت: کان نصرانیا[۷]۔
ابن اثیر (م ۳۶۰ھ) لکھتے ہیں: فلقیه ابولؤلؤة غلام المغیرةو کان نصرانیا[۸]۔
الحاکم (م ۴۰۵ھ) لکھتے ہیں: عن ثابت عن ابی رافع و کان اسمه فیروز و کان نصرانیا[۹] (رقم الحدیث ۴۵۱۲)
القاضی ابن العربی المالکی (۵۴۳ھ) لکھتے ہیں: ابولؤلؤةعبد نصرانی للمغیرة بن شعبة[۱۰]۔
ابن الوردی (م ۷۴۹ھ) لکھتے ہیں: و کان ابو لؤلؤة نصرانیا[۱۱]۔
ابن الملقن (۸۰۴ھ) لکھتے ہیں: غلام نصرانی للمغیرة بن شعبة[۱۲]۔
ابن خلدون (م ۸۰۸ھ) لکھتے ہیں: کان للمغیرة بن شعبة مولی من نصاری العجم[۱۳]۔
ملاعلی قاری (م ۱۰۱۴ھ) لکھتے ہیں: واستشهد علی ید نصرانی اسمه ابو لؤلؤة غلام مغیرة بن شعبة[۱۴]۔
الزرقانی (م ۱۱۲۲ھ) لکھتے ہیں: ابولؤلؤة فیروز النصرانی[۱۵]۔
دوسرے وہ ہیں جنہوں نے پہلے اسے نصرانی لکھا، اس کے بعد لفظ ''قیل'' سے اس کا مجوسی ہونا لکھا ہے۔

۵۔ابوجعفر محمد بن جریر الطبری، تاریخ الطبری، دارالکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۲۰۰۸ء ج ۲ ص ۵۵۹۔
۶۔مطہر بن طاہر مقدسی، کتاب البدء والتاریخ، مطبعۃ برطرند، شالون ۱۹۱۶ء، ج ۵ ص ۱۸۸
۷۔ابوبکر محمد بن الحسین الآجری، الشریعۃ، دارالوطن، الریاض/السعودیۃ، ۱۹۹۹ء ج ۴ ص ۱۹۲۴۔
۸۔ابوالحسن علی بن محمد معروف بہ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، دارالحدیث القاہرہ، ۲۰۱۰ء ج ۲ ص ۳۵۳۔
۹۔ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم، المستدرک علی الصحیحین، دائرۃ المعارف النظامیہ، حیدرآباد ۱۳۴۱ھ، ج ۳ ص ۹۱۔
۱۰۔قاضی محمد بن عبداللہ ابن العربی المالکی، المسالک فی شرح مؤطا مالک، دارالغرب الاسلامی، ۲۰۰۷ء ج ۵ ص ۸۶۔
۱۱۔عمر بن مظفر معروف بہ ابن الوردی، تاریخ ابن الوردی دارالکتب العلمیہ، لبنان/بیروت، ۱۹۹۶ء ج ۱ ص ۱۴۲۔
۱۲۔سراج الدین ابی حفص عمر الشافعی معروف بہ ابن الملقن، التوضیح لشرح الجامع الصحیح، دارالنوادر، دمشق، سوریا، ۲۰۰۸ء ج ۲۰ ص ۲۹۷۔
۱۳۔عبدالرحمٰن بن خلدون، تاریخ ابن خلدون، دارالکتب العلمیہ، بیروت ۲۰۰۶ء ج ۲ ص ۵۴۳۔
۱۴۔علی بن سلطان محمد ملا ہروی قاری، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، دارالفکر بیروت، لبنان، ۲۰۰۲ء ج ۱ ص ۴۰۔
۱۵۔محمد بن عبدالباقی بن یوسف زرقانی، شرح الزرقانی علی مؤطا الامام مالک، مکتبۃ الثقافۃ، قاہرہ ۲۰۰۳ء ج ۱ ص ۱۷۹۔

ابن الملقن (م۸۰۴ھ) کا قول گذر چکا ہے۔ وہ ایک اور کتاب میں اس طرح لکھتے ہیں: غلام نصرانی وقیل مجوسی[16]۔

بہاء الدین محمد بن احمد المکی الحنفی (م۸۹۴ھ) لکھتے ہیں: وکان نصرانیا وقیل مجوسیا[17]۔

گویا تیسری سے بارہویں صدی ہجری تک ابولؤلؤ کو اہم مؤرخین ومحدثین نے نصرانی لکھا ہے۔

تیسرے قول میں پہلے مجوسی، پھر لفظ ''قیل'' سے اس کے نصرانی ہونے کی روایت نقل کی ہے۔

علامہ ابن عبدالبر (م۴۶۳ھ) نے لکھا ہے کہ ابولؤلؤۃ کے بارے میں ہمارے درمیان اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ مجوسی تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نصرانی تھا۔ اس کے بعد نصرانیت کی تائید میں مشہور تابعی عمرو بن میمون الاودی (م۷۴ھ) کا قول نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں: اختلف علینا فی شان ابی لؤلؤۃ فقال بعضهم کان مجوسیا، وقال بعضهم کان نصرانیا، فحدثنا ابو سنان ـــ عن عمرو بن میمون الاودی قال: کان ابولؤلؤۃ أزرق نصرانیا[18]۔

الصفدی (م۷۶۴ھ) لکھتے ہیں: وکان مجوسیا وقیل نصرانیا ازرق[19]۔

القلقشندی (م۸۲۱ھ) لکھتے ہیں: وکان مجوسیا، وقیل نصرانیا[20]۔

چوتھے وہ ہیں جنہوں نے اس کو صرف مجوسی لکھا ہے۔ نصرانیت کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا ہے۔

مصنف عبدالرزاق (م۲۱۱ھ) میں ہے: عن الزهری، کان مجوسیا فی اصله[21] (رقم الحدیث ۹۷۷۵)۔

ابن حبیب (م۲۴۵ھ) لکھتے ہیں: ابولؤلؤۃ المجوسی[22]۔

المسعودی (م۳۴۶ھ) میں ہے: وکان یدعی ابالؤلؤۃ وکان مجوسیا من اهل نهاوند[23]۔

۱۶۔ سراج الدین معروف بہ ابن الملقن، الاعلام بفوائد عمدۃ الاحکام دار العاصمۃ للنشر والتوضیع، السعودیہ ۱۹۹۷ء ج ۱ ص ۱۴۳۔

۱۷۔ محمد بن احمد المکی الحنفی، تاریخ مکۃ المشرفۃ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان ۲۰۰۴ء ص ۳۲۳۔

۱۸۔ یوسف بن عبداللہ معروف بہ ابن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، دائرۃ المعارف النظامیہ، حیدرآباد، ۱۳۱۹ھ، ج ۴ ص ۴۳۲۔

۱۹۔ صلاح الدین خلیل بن ایبک الصفدی، الوافی بالوفیات، المعہد الالمانی للابحاث الشرقیہ، بیروت ۲۰۰۹ء ج ۲۴ ص ۱۰۰۔

۲۰۔ احمد بن علی بن احمد القلقشندی، مآثر الانافۃ فی معالم الخلافۃ، مطبعۃ حکومۃ الکویت، کویت، ۱۹۸۵ء ج ۱ ص ۸۸۔

۲۱۔ ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام صنعانی، المصنف، المکتب اسلامی، بیروت، طبع ثانی، ۱۹۸۳ء جلد ۵ ص ۴۷۴۔

۲۲۔ ابوجعفر محمد بن حبیب، کتاب المحبر، مطبعۃ دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباد، ۱۹۴۲ء ص ۱۴۔

۲۳۔ ابوالحسن علی المسعودی، مروج الذہب ومعادن الجوہر، انپیریل پریس پیرس ج ۴ ص ۲۲۶۔ بدون سنہ۔

الطبرانی (م۳۶۰ھ) کی المعجم الکبیر میں ہے (رقم الحدیث ۷۷): عن ابن عباس قال: و کان مجوسیا[۲۴]۔ امام ذہبی نے تاریخ اسلام میں حضرت ابن عباس کے قول پر اعتماد کیا ہے[۲۵]۔ عصر حاضر میں حضرت ابن عباسؓ اور امام زہریؒ کے قول کو شہرت حاصل ہوئی۔ علامہ شبلی اور محمود عقاد وغیرہ نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

سطور بالا میں جو اقوال نقل کیے گئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری سے بارہویں صدی ہجری تک کے مؤرخین اور قدیم علما کی ایک بڑی تعداد ابولؤلؤ کو نصرانی قرار دیتی رہی ہے۔ اس لیے مولانا فراہیؒ کا اس کو نصرانی لکھنا ''تسامح'' نہیں ہے۔ مولانا فراہیؒ نے امام طبری و ابن الاثیر جیسے بیشتر مؤرخین کے قول پر اعتماد کیا اور اس کو ترجیح دی ہے۔

ایسی صورت میں مراسلہ نگار کی اس ''اہم تجویز یا رائے'' کہ ''اگر فاضل مضمون نگار نے مولانا فراہیؒ واصلاحیؒ کے اس تسامح پر اپنے مضمون میں یہ ضروری حاشیہ لگایا ہوتا تو برسوں سے شائع ہونے والی اس غلطی کی اصلاح ہو جاتی۔'' کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس لیے کہ یہ غلطی تھی ہی نہیں کہ اس کی اصلاح کی ضرورت محسوس کی جاتی۔

البتہ راقم نے اپنے مضمون میں اگر یہ حاشیہ لگا دیا ہوتا کہ قدما کے یہاں ابولؤلؤ کے متعلق دونوں قسم کے اقوال پائے جاتے ہیں تو مراسلہ نگار اس زحمت سے بچ جاتے۔

کلیم صفات اصلاحی

تصحیح کی تصحیح

معارف (جون ۲۰۲۴ء) میں شائع شدہ مراسلہ (کریمہ صبغۃ اللہ رحمۃ اللہ علیہا اور ان کی مرتبہ کتاب میں دارالمصنّفین و معارف کے حوالے) میں راقم نے ''معارف میں شائع شدہ ایک مضمون سے متعلق ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم کے ایک خط کا یہ اقتباس نقل کیا تھا: ''کوئی پندرہ بیس سال ہوئے ''معارف'' میں سید صاحب نے امریکا کی مسلمانوں کی طرف سے کولمبس سے قبل دریافت پر ایک

۲۴۔ حافظ ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی، المعجم الکبیر، مکتبۃ الاصالۃ والتراث، الشارقۃ (شارجہ) ۲۰۱۰ء ج ۱ ص ۶۱۔

۲۵۔ شمس الدین محمد ذھبی، تاریخ الاسلام، المکتبۃ التوفیقیۃ، قاہرہ۔ مصر بدون سنہ ج ۳ ص ۶۱۔

مضمون لکھا تھا۔معلوم نہیں یہ پرچہ بزم ادب سے دستیاب ہو سکے گا یا نہیں؟''۔اس کے بعد مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مضمون کے تعلق سے میں نے یہ تحریر کیا تھا: ''یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس مکتوب میں مذکور مضمون (کولمبس سے پہلے امریکا کی دریافت) سہواً سید صاحب مرحوم سے منسوب ہو گیا ہے''۔اسی ضمن میں زیرِ بحث موضوع پر معارف میں شائع شدہ مولانا سید ریاست علی ندویؒ اور بعض دیگر اسکالرز کی تحریروں کا ذکر تھا۔مراسلہ کی اشاعت کے کچھ دنوں بعد سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ کی مرتبہ کتاب ''بزم رفتگاں'' پڑھتے ہوئے یہ معلوم ہوا کہ کولمبس سے پہلے عربوں کی امریکہ کی دریافت پر سید صاحب نے بھی ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جسے انہوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے خصوصی اجلاس (منعقدہ ۲۵۔۲۹/مارچ ۱۹۳۷ء بمقام علی گڑھ) میں پیش کیا تھا (بزمِ رفتگان، ۱/۹۳)۔پھر ''اشاریہ معارف'' (مرتبہ جمشید احمد ندوی) دیکھنے پر یہ انکشاف ہوا کہ محترم سید صاحب کا مضمون ''عرب اور امریکہ'' کے عنوان سے معارف میں (دو قسطوں (۴۳/۳، مارچ ۱۹۳۹ء، ص ۱۶۵۔۱۸۵؛ ۴۳/۴، اپریل ۱۹۳۹ء، ص ۲۴۵۔۲۵۹) میں شائع ہوا تھا۔سید صاحب نے یہ مضمون اصلاً اپنی معروف کتاب ''عربوں کی جہاز رانی'' کے لئے تحریر کیا تھا، جیسا کہ مضمون کے شروع میں انہوں نے اپنے نوٹ میں یہ واضح فرمایا تھا: ''یہ مضمون دراصل ''عربوں کی جہاز رانی'' کے سلسلہ میں ۱۹۳۱ء میں لکھا گیا تھا، مگر چند حوالوں کے ناقص ہونے کے سبب سے وہ اس میں شامل نہیں کیا گیا۔۱۹۳۷ء میں علی گڑھ مسلم [ایجوکیشنل] کانفرنس کی جوبلی میں ''اسلامی علوم وفنون'' کے شعبہ میں پڑھ کر سنایا گیا'' (معارف، مارچ ۱۹۳۹ء، ص ۱۶۵)۔

یہ ناچیز اپنی کم علمی اور غلطی کا اعتراف کرتا ہے کہ اس نے مراسلہ میں یہ لکھ دیا تھا: ''مکتوب میں مذکور مضمون (کولمبس سے پہلے امریکا کی دریافت) سہواً سید صاحب مرحوم سے منسوب ہو گیا ہے''۔

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی
اسلام منزل، اقراء کالونی، علی گڑھ

zafarul.islam@gmail.com

معارف کے مندرجات

ابھی سرسری نظر ڈالی تو احساس ہوا کہ اداریے کے بعد ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی اور جناب وارث

مظہری کے مقالات کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا چاہیے، خطوں میں ڈاکٹر عارف نوشاہی صاحب بھی توجہ چاہتے ہیں۔ آئندہ ہفتہ معارف کے ساتھ ہی گزرے گا۔

والسلام

ڈاکٹر خالد ندیم، سرگودھا

dr.khalidnadeem@gmail.com

***

مکرمی!

مدیر معارف السلام علیکم

امید کہ مزاج عالی بخیر ہوگا۔

معارف جون ۲۰۲۴ء کے شمارہ میں ناچیز کے مقالہ ''وفات شبلی پر قطعہ تاریخ اور لوح مزار'' کے متعلق جناب ڈاکٹر عارف نوشاہی صاحب کا مراسلہ شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے ناچیز کے مقالہ کے اغلاط کی نشاندہی کی ہے اور بعض مشورے بھی دیے ہیں۔

محترمی! علامہ شبلی کی وفات پر قطعات تاریخ لکھنے کا قصہ ایک صدی پہلے کا ہے۔ وفات شبلی کے وقت جو رسائل نکلتے تھے تقریباً ان تمام رسائل کے سیکڑوں شماروں کا احاطہ اور ان کی ورق گردانی کے بعد جن رسائل وجرائد میں قطعات تاریخ اور کتبات لوح مزار ملے انہیں جوں کا توں یکجا کردیا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس مقالہ کی تیاری میں ایک سال سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا۔

اس مقالہ کے کئی علمی پہلو تھے۔ مثلاً قطعات تاریخ اور کتبات لوح مزار کی تلاش وجستجو اور پھر ترتیب وتدوین اور اشاعت، شعرا کے حالات اور علامہ شبلی سے ان کے مراسم وتعلقات کی تفصیل اور اس کی نوعیت وغیرہ۔ چونکہ محض قطعات تاریخ، کتبات لوح مزار اور شعرا کے انتہائی مختصر تعارف ہی میں مقالہ بہت طویل ہوگیا اس لئے تعمیہ وتخرجہ، اشعار کی تقطیع اور خارج از بحر اشعار وغیرہ فنی مباحث کو نظرانداز کردیا گیا۔ مقالہ میں اس نوع کے جو مباحث شامل ہیں وہ مقالہ نگار کے قلم سے نہیں بلکہ قطعہ

نگاروں کی توضیحات ہیں۔اسی طرح قطعات میں کاما،انورٹیڈ کاماز، انڈر لائن یامادہ تاریخ کی جو نشاندہی نہیں کی گئی ہے وہ شعرااورقطعہ نگاروں کی کمیاں ہیں، نہ کہ اس ناچیز مقالہ نگارکی۔بہر حال صاحب مراسلہ نے جن اغلاط کی نشاندہی کی ہے ان میں جومناسب ہوں گی ان کو مقالہ میں کتابی صورت میں شائع کرتے وقت درست کر دیا جائے گا۔

ڈاکٹر عارف نوشاہی صاحب کی بعض باتیں زیادتی معلوم ہوئیں،مثلاً انہوں نے تساہلی کا بے جاالزام عاید کیا ہے۔کیاایک صدی بعدان قطعات تاریخ اورکتبات لوح مزارکی تلاش وجستجو اورجمع و تدوین تساہل پسندی ہے؟۔کیابرسوں خون دل جلاکرعلم وتحقیق اورتصنیف وتالیف کا کام سہل انگاری ہوسکتا ہے؟۔ان باتوں کوڈاکٹر عارف نوشاہی سے بہترکون سمجھ سکتا تھا۔افسوس انہی نے اس دیدہ ریزی اور پتہ ماری کے اس کام کوسہل انگاری سے تعبیرکیا۔ایک بات اورسمجھ میں نہیں آئی کہ مقالات لکھنے میں کمپوزنگ کی غلطیاں عموماًدرآتی ہیں۔انہیں اس طرح پیش کرنا گویاوہ مقالہ نگارکی کوتاہیاں ہیں کہاں تک درست ہے؟۔ان کے مراسلے میں صفحات کی ترتیب کے ساتھ اغلاط کی جونشاہی کی گئی ہے ان میں بیشتر غلطیاں کمپوزنگ کی ہیں،اس کے باوجود ناچیز ڈاکٹر صاحب موصوف کا بے حدممنون اورشکرگذار ہے کہ انہوں نے اس ہیچمداں کے مقالہ کو نہایت توجہ سے پڑھااوراغلاط کی نشاندہی فرمائی۔اللہ انہیں جزائے خیر دے۔والسلام

محمدالیاس الاعظمی
پورہ غلامی شہراعظم گڑھ
۱۸؍جون ۲۰۲۴ء

دارالمصنّفین کے لیل ونہار

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی ''شبلی ایوارڈ'' سے سرفراز

معروف اسکالر ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا تعلق اعظم گڑھ سے ہے۔ موضع مہراج پور میں ۲۳/ستمبر ۱۹۶۶ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد جامعۃ الرشاد میں داخلہ لیا۔ عالم، فاضل، منشی، کامل، عربی فارسی بورڈ الٰہ آباد سے اور ایم اے اردو آگرہ یونیورسٹی، آگرہ سے کیا۔ ''دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی سند پوروانچل یونیورسٹی، جون پور سے حاصل کی۔ اس وقت پری ہائر سکنڈری اسکول میں پرنسپل ہیں۔ لیکن ان کی شہرت اصلاً اردو کے ایک کثیر التصانیف مصنّف، ایک بالغ نظر محقق، ایک متوازن ومعتدل اسلوب کے حامل ادیب ونقاد اور سب سے بڑھ کر ماہر شبلیات کی حیثیت سے ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اب تک کل چھوٹی بڑی ۶۲ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ بالخصوص علامہ شبلی نعمانیؒ پر جس تسلسل اور انہماک سے کام ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے، اس کی مثال پوری علمی دنیا میں شاید ہی مل سکے۔ متعلقات شبلی، کتابیات شبلی، آثار شبلی، شذرات شبلی، مراسلات شبلی، علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی کا حصہ، مکتوبات شبلی، خطبات شبلی نو دریافت نام سے ان کی تصنیفات تو صرف دارالمصنّفین نے شائع کی ہیں۔ ان کے علاوہ شبلی سخنوروں کی نظر میں، کلام شبلی کے اعلام واشخاص، بیان شبلی (۵ جلدیں)، تصانیف شبلی کے تراجم، افادات شبلی، شبلی اقتباسات کی روشنی میں، اثرات شبلی (۲ جلدیں) وغیرہ جیسی ان کی کل تین درجن تصنیفات منظر عام پر آ چکی ہیں۔ شبلی سے متعلق ان کی درج بالا نمایاں خدمات کے اعتراف میں دارالمصنّفین نے بجا طور پر انہیں ''شبلی ایوارڈ'' دینے کا فیصلہ کیا۔

دارالمصنّفین کی تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقع ہے جب کسی اسکالر کو اس قسم کے اعزاز کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ ادارہ کے سرگرم رکن ڈاکٹر سلمان سلطان اور ریحان اللہ خاں لائف ممبر شبلی اکیڈمی نے اس ایوارڈ کی تحریک کی تھی۔ ۲۴/جون ۲۰۲۴ء کو بعد نماز مغرب دارالمصنّفین کے کانفرنس ہال میں اراکین ادارہ اور معززین شہر کی موجودگی میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو یہ ایوارڈ ناظم دارالمصنّفین ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں نے تفویض کیا۔ جو ایک شال، پچاس ہزار روپے نقد اور ایک توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ ایوارڈ کی رقم ڈاکٹر صاحب نے بطور ہدیہ دارالمصنّفین کو پیش کرنے کا اعلان کیا۔ امید ہے دارالمصنّفین کے اس اقدام پر ملک بھر میں پسندیدگی کا اظہار کیا جائے گا۔

ک، ص اصلاحی

رسید کتب موصولہ

ڈاکٹر رفیق احمد، **تعلیمی نظام کے مختلف مراحل** : ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، صفحات :۳۰۴، سالِ اشاعت۲۰۲۲ء، قیمت:۲۵۰/روپے، موبائل نمبر:۹۴۵۰۷۵۵۸۲۰

تبسم اعظمی، **جہاں کوئی نہ ہو (نظمیں)**: سرائے میر نرسنگ ہوم، سرائے میر، اعظم گڑھ، صفحات:۱۷۶، سالِ اشاعت۲۰۱۹ء، قیمت:۲۰۰/روپے، موبائل نمبر:۹۹۸۴۷۸۴۴۴۵

شاہ ظفر الیقین، **خطبات سر شاہ محمد سلیمان**: پروفیسر کالونی، گیانپور، بھدوہی، صفحات :۲۷۸، سالِ اشاعت۲۰۲۴ء، قیمت:۳۰۰/روپے، موبائل نمبر:۹۴۵۰۲۵۵۵۶۸

محمد ایوب واقف، **سیفی سرونجی ادب کا پیدل سپاہی**: سیفی لائبریری، سرونج (ایم پی)، صفحات :۱۱۲، سالِ اشاعت۲۰۲۴ء، قیمت:۲۰۰/روپے، موبائل نمبر:۹۴۲۵۶۴۱۷۷۷

آصف اعظمی، **مجروح فہمی**: آصف اعظمی، نئی دہلی، صفحات:۶۰۰، سالِ اشاعت۲۰۱۹ء، قیمت:۷۰۰/روپے، ایمیل:asifazmi@hotmail.com

محمد علاء الدین الندوی، **محاضرات فی تاریخ الادب العربی** : ندوۃ العلماء لکھنؤ، صفحات۴۰۰، سالِ اشاعت۲۰۲۲ء، قیمت۴۰۰/روپے، موبائل نمبر:۹۸۳۹۴۴۹۹۲۵

ڈاکٹر محمد راشد الندوی (پیش کش: ڈاکٹر ابوذر متین)، **معن بن اوس المزنی**: تحقیق دیوانــه و دراسة حیــاتـه و شعره : براؤن بکس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، صفحات:۳۲۰، سالِ اشاعت۲۰۲۲ء، قیمت:۶۰۰/روپے، موبائل نمبر:۷۰۹۰۶۸۶۳۴۶۱

مفتی محمد منظر مصطفیٰ، **ملفوظات غریب نواز کا تحقیقی جائزہ**: کتب خانہ امجدیہ، دہلی، صفحات:۳۶۸، سالِ اشاعت۲۰۲۴ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر:۹۸۱۰۵۴۷۶۷۴

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، **مولانا شبلی نعمانی، شخصیت اور ادبی خدمات**: پتہ: درج نہیں، صفحات : ۵۳۶، سالِ اشاعت۲۰۲۳ء، قیمت:۱۰۰۰/روپے، موبائل نمبر:۹۸۳۹۵۸۲۲۱۱

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، **یادِ نو بہار**: پتہ: درج نہیں، صفحات:۳۸۸، سالِ اشاعت۲۰۲۲ء، قیمت:۸۰۰/روپے، موبائل نمبر:۹۸۳۹۵۸۲۲۱۱

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	-/2000	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبی (خاص ایڈیشن مکمل ۷ جلدیں)	-/2800	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	125/-
مقدمہ سیرۃ النبی	30/-	سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات شبلی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	400/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم اول	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم دوم	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم سوم	150/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم چہارم	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم پنجم	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن)		انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-
تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی	350/-	مکاتیب شبلی اول 〃 〃	--
خطبات شبلی	150/-	مکاتیب شبلی دوم 〃 〃	190/-
الکلام	350/-	اسلام اور مستشرقین چہارم	
علم الکلام	200/-	(علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

JULY 2024 Vol- 211(7) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم کتابیں

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندوی	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعاتِ شبلی	//	550/-
حیاتِ سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازیؒ	مولانا عبدالسلام ندوی	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندوی	600/-
تذکرۃ المحدثین اول	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	200/-
تذکرۃ المحدثین دوم	//	225/-
تذکرۃ المحدثین سوم	//	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلی	330/-
تاریخ اسلام اول و دوم (مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندوی	560/-
تاریخ اسلام سوم و چہارم (مجلد)	//	500/-
تاریخ صقلیہ اول و دوم (مجلد)	سید ریاست علی ندوی	800/-
تاریخ اندلس (چار جلدیں)	//	1200/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	550/-